روبینہ فیصل کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

سیشن: 2021-2025

مقالہ نگار:
محمد عرفان
رول نمبر: 3656-BH-U-21

نگران مقالہ:
ڈاکٹر احتشام علی
ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہ اردو

جی سی یونیورسٹی لاہور

روبینہ فیصل کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

سیشن: 2021-2025

مقالہ نگار:	نگران مقالہ:
محمد عرفان	ڈاکٹر احتشام علی
رول نمبر: 3656-BH-U-21	ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہ اردو

جی سی یونیورسٹی لاہور

روبینہ فیصل کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

یہ مقالہ بی۔ اے (آنرز) اردو کی جزوی تکمیل کے سلسلے
میں جی سی یونیورسٹی، لاہور کو سند عطا کیے جانے کے لئے
پیش کیا گیا۔

بی۔ اے (آنرز)

مضمون

اُردو

سیشن:2021-2025

مقالہ نگار:		نگران مقالہ:
محمد عرفان		ڈاکٹر احتشام علی
رول نمبر:	3656-BH-U-21	ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہ اردو

جی سی یونیورسٹی لاہور

تصدیق برائے تکمیل مقالہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیر نظر مقالہ

بعنوان

روبینہ فیصل کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

محمد عرفان، رول 3656-BH-U-21 نے بی۔ اے (آنرز) اُردو کی سند کے حصول کے لئے میری زیر نگرانی مکمل کیا۔

تاریخ:____________

نگران مقالہ:

____

ڈاکٹر احتشام علی

ایسوسی ایٹ پروفیسر

جی سی یونیورسٹی، لاہور

بتوسط

کنٹرولر امتحانات:

جی سی یونیورسٹی، لاہور

صدر شعبہ اردو

جی سی یونیورسٹی لاہور

جی سی یونیورسٹی، لاہور

(شعبۂ اُردو)

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ محمد عرفان رول نمبر 3656-BH-U-21

میقات 2021-2025 متعلم بی۔ اے (آنرز) تحقیق پروجیکٹ/مقالہ بعنوان:

روبینہ فیصل کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

اُس کی ذاتی کاوش ہے جس میں تحقیقی اصولوں کے مطابق حواشی و حوالہ جات کا اہتمام کیا گیا ہے۔

دستخط فوکل پرسن: ____________________ **دستخط نگران:** ____________________

نام: ____________________ **نام:** ____________________

اقرار نامہ

محمد عرفان، رول نمبر 3656-BH-U-21 میقات 2021-2025 اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ میں پیش کیا جانے والا مواد بعنوان :

روبینہ فیصل کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

میری ذاتی کاوش ہے اور یہ پاکستان یا پاکستان سے باہر کسی بھی تحقیقی یا تعلیمی ادارے کی طرف سے شائع، طبع یا پیش نہیں کیا گیا۔

دستخط مقالہ نگار:________________ تاریخ: ________________

محمد عرفان

انتساب:

والدین کے نام

جن کی دعاؤں سے

میں آج اس مقام پر ہوں

فہرست

صفحات	ابواب بندی
۹	پیش لفظ
۱۲	باب اول: روبینہ فیصل شخصیت اور فن
۳۳	باب دوم: روبینہ فیصل کے افسانوں کا کرداری مطالعہ
۵۸	باب سوم: روبینہ فیصل کے افسانوں میں سماجی شعور
۱۰۱	☆ محاکمہ
۱۰۴	☆ کتابیات

پیش لفظ

پاکستانی عورت زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب میں بھی اپنی انفرادیت ثابت کرنے کے لیے سرگرم عمل نظر آتی ہے۔ اُن کا سیاسی، سماجی اور عصری شعور مردوں سے کسی طور بھی کم نہیں ہے۔ اردو ادب میں خواتین تخلیق کاروں کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر ہم اردو کے افسانوی ادب کا مطالعہ کریں تو خواتین کی ادبی وعلمی خدمات سے چشم پوشی یا اس سے انحراف ایک غیر منصفانہ رویہ تصور ہوگا۔ کیوں کہ اردو ادب خواتین افسانہ نگاروں کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں کے تذکرے کے بغیر افسانہ نگاروں کی تاریخ مرتب کرنا کسی طور پر بھی درست نہیں۔

ادب چونکہ معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اور رہبر بھی، اسی لیے وہ تمام تر واقعات و حادثات اور حیات انسانی کے گونا گوں تجربات و احساسات کو نہایت اختصار اور گہرائی و گیرائی کے ساتھ افسانہ میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ صنف افسانہ کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنا کر خواتین تخلیق کاروں نے اپنے عصری مسائل، انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کی پیچیدگیوں اور شکست و ریخت کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا اس کام کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

خواتین نے بھی اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے زیر نظر مقالے میں ایک خاتون افسانہ نگار کی تخلیقی کاوشوں کے فکروفنی جائزے کو مبسوط و مربوط انداز میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے زیر نظر مقالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول میں مصنفہ کے حالات اور ذاتی زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔

باب دوم میں روبینہ فیصلہ کے ان کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جن کو روبینہ نے تنگ و تاریک گلیوں میں بھٹکتے سہارا دیا اور معاشرے میں ان کو اجاگر کیا ان کے مسائل دکھ تکلیفوں کو واضح کیا۔

اس باب میں جائزہ کیا گیا ہے کہ یہ افسانوی کردار کہاں سے آئے ہیں اور ان کا حقیقی دنیا سے کتنا تعلق ہے۔

باب سوم: اس باب میں مصنفہ کے سماجی شعور کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے کہ روبینہ فیصل کے ہاں سماج کی آ گاہی اور مشاہدات و تجربات کی کتنی گہرائی ہے اور کس زاویہ نظر سے معاشرے کو دیکھتی ہیں۔

تحقیق کی روشنی میں مقالے کے آخر میں مجموعی جائزہ کی صورت میں گذشتہ ابواب کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔

میں خدائے بزرگ و برتر کا بے پایاں رحمتوں اور عنایتوں کا شکر گزار ہوں اگر دنیا کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سارے سمندر سیاہی تو بھی اس کی ثنا اور شکر گزاری کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے وہ رب عظیم جس کی مصلحتوں کے سامنے انسان کی بصیرت و بصارت اور فہم و ادراک محدود اور ہیچ ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر جہاں میرے قدم لڑکھڑائے اور ارادے متزلزل ہوئے اس ذات باری تعالیٰ نے ہمیشہ میری مدد کی لاکھوں کروڑوں مرتبہ درود وسلام اس پاک ہستی پر کہ ہمیں ان کے اُمتی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ خدا ان کی محبت سے ہمارے قلوب اذہان کو منور کرے اور عملی طور پر ان کی پیریو کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

میں استادِ محترم ڈاکٹر احتشام علی کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے دوران مقالہ بہت شفقت اور ہمدردی کے ساتھ میرے مسائل سنے اور ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا۔ بلا شبہ ان کے تعاون اور مدد کے بغیر اس کام کو وقت پر مکمل کرنا ممکن نہ تھا۔ میں استادِ محترم کا تا حیات احسان مند رہوں گا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی اُن کی عمر دراز کرے اور ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ (آمین)

ماں جی اور ڈیڈی جی کی محبت اور شفقت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے شاید دنیا کی لغت میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے میری ہر کامیابی کے پیچھے ان کی دعائیں شامل رہی ہیں۔ زندگی کی تپتی دھوپ میں یہ شجر سایہ دار میرے سر پر سلامت رہیں۔ (آمین)

میں اپنی بہنوں کا بھی بے حد شکر گزار ہوں۔ انہوں نے نہ صرف میری ذہنی غیر حاضری کو درگزر کیا بلکہ گھر کے ہر کونے میں میری پھیلائی ہوئی بے ترتیبی کو سمیٹا ان کی محبتوں کا قرض چکانا ممکن نہیں اور ان کی پر خلوص دعاؤں کا کوئی نعم البدل نہیں اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ سلامت اور خوش رکھے۔ (آمین)

میں اپنے بھائیوں محمد رضوان اور عامر خاں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں ے ان دونوں کا کبھی روٹھنا کبھی مان جانا اور پیار بھری نوک جھونک سرمایہ حیات ہے تاحیات ان دونوں کا مجھ پر قرض رہے گا اگر یہ نا ہونے تو شاید میں جی سی یونیورسٹی کبھی نہ آ سکتا اور نہ پڑھ پاتا۔۔۔

میں اپنے منہ بولے دو بھائیوں مدنی حسن اور آفتاب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے لاہور کی گلیوں میں کبھی تنہا نہیں چھوڑا ہمیشہ بازو بنے رہے اللہ ان کو خوش رکھے۔ (آمین)

میں اپنی دوست آمنہ کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جو دن میں بار بار میسجز کر کے پوچھتی اب کہاں تک تھیسز پہنچا ہے۔ پریشان نہیں ہونا۔۔۔ ہو جائے گا دوران تھیسز اُن کی مدد اور دعاؤں کا شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ ان کے دل کی ہر دعا کو قبول کرے اور عمر دراز کرے۔

میں اپنے دوست مربی امانت کا بھی شکر گزار ہوں جس نے بہت حوصلہ دیا میں جی سی یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری ذات کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا میں خصوصی طور پر شعبہ اردو کے اساتذہ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے نہ صرف پڑھایا بلکہ میری ذات کی تعمیر و تشکیل بھی کی۔۔۔ اللہ تعالیٰ اُن کو بھی خوش و خرم رکھے۔

میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کا شکر گزار ہوں جس نے مجھ کو بہت کچھ سیکھنے کا سنہری موقع دیا اور باقی زندگی گزارنے کے لیے یادیں دی جو تاحیات مجھے جینے کا سہارا دیں گی۔

محمد عرفان

بی۔ ایس آنرز (اردو)

باب اول:

روبینہ فیصل شخصیت اور فن

روبینہ فیصل شخصیت اور فن

تعارف:

روبینہ فیصل اردو زبان کی ایک نامور مصنفہ ہیں روبینہ فیصل پاکستان کے شہر فیصل آباد (لائل پور) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم کوہ نور گرامر ہائی سکول فیصل آباد سے ہوئی اور اس کے بعد ان کا خاندان ہمیشہ کے لیے لاہور منتقل ہو گیا۔ انہوں نے ایف ایس سی، ہیلے کالج سے بیچلر آف کامرس کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد فارمن کرسچن کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ماسٹر ڈگری مکمل کی۔ روبینہ فیصل ایک کالم نگار، صحافی، شاعرہ، اسکرین رائٹر اور فلم ڈائریکٹر ہیں۔

روبینہ فیصل زمانہ طالب علمی سے ہی اپنی تحریری صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کی خواہش مند تھیں اور وہاں وہ ہمیشہ کالج اور یونیورسٹی سطح کے فورمز میں حصہ لیتی تھیں۔ ان کا باقاعدہ لکھنے کا دور اس وقت شروع ہوا جب وہ ایک ہفتہ وار اردو اخبار میں شامل ہوئیں اور ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا۔ روبینہ کا پہلا کالم جنرل ضیاء الحق پر شائع ہوا تھا جبکہ انہوں نے ضیا کا موازنہ ذوالفقار علی بھٹو سے کیا تھا۔ انہوں نے قارئین کو متوجہ کیا اور اس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کالم میں انہوں نے لوگوں کو ان کے خیالات سے متفق ہونے سے زور نہیں دیا بلکہ انہوں نے لوگوں کو ایک جگہ فراہم کی کہ جو سوچنا پسند کریں اور جن میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہو سکتی ہے وہ فرق کو خود سے محسوس کر سکتے ہیں۔ روبینہ شاعری بھی لکھتی ہیں لیکن بظاہر وہ خود کو شاعرہ نہیں مانتی اور کالم: مختصر کہانیاں اسٹیج اور ٹی وی اسکرپٹ لکھنے میں زیادہ آرام محسوس کرتی ہیں۔

روبینہ نے راقم کو بتایا۔

> ''2000ء میں لاہور پاکستان سے کنیڈا ہجرت کر گئی تھیں اور وہ چار بچوں کی قابل فخر ماں ہیں وہ اس وقت اوک ویل اونٹاریو (کنیڈا) میں مقیم ہیں۔''[۱]

روبینہ فیصل پاکستان کے ''نوائے وقت'' کے لیے ہفتہ وار میں کئی سیاسی کالم لکھ چکی ہیں۔ ان کی پہلی

کتاب شائع شدہ کالموں کی ایک تالیف جو ۲۰۱۰ء میں ’’روٹی کھاتی مورتیاں‘‘ شائع ہوئی اس دوران وہ مختصر کہانیاں لکھتی رہیں اور کئی ادبی محفلوں میں پیش کرتی رہیں۔ مارچ ۲۰۱۶ء میں ان کی مختصر کہانیوں کی دوسری اشاعت ’’خواب سے لپٹی کہانیاں‘‘ شائع ہوئی۔ ان مختصر کہانیوں میں مذہب، سماجی، ثقافت اور گھریلو مسائل کے تنازعات کو دکھایا گیا ہے۔ ان کا آزاد نظم شاعری کا ایک مجموعہ ۲۰۱۸ء میں ’’ایسا ضروری تو نہیں‘‘ کے نام سے جاری کیا گیا اور ان کی مختصر کہانیوں کی ایک اور کتاب ’’گمشدہ سائے‘‘ ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی۔ اور سال ۲۰۲۳ میں روبینہ نے اپنا ناول ’’نارسائی‘‘ شائع کیا ہے روبینہ فیصل ۲۰۱۶ میں ان کی کتاب ’’خواب سے لپٹی کہانیاں‘‘ کے لیے ’’خالد احمد ایوارڈ‘‘ وصول کر چکی ہیں ان کا ’’دستک‘‘ کے عنوان سے مقامی چینل میں ٹاک شو بھی کمیونٹی میں مقبول عام ہے۔

اُن کے خاوند چارٹرا کاؤنٹنٹ ہیں۔

روبیہ اپنے شوہر کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ’’فیصل محمود میرے شوہر کا تعاون حسب معمول میرے ساتھ ہے میری ہر تحریر کو شوق سے پڑھتے ہیں اور ان کا یہ شوق مجھے مزید لکھنے پر اکساتا ہے کیونکہ ہوا ایک بھی سچا قاری مل جائے تو لکھنے والے کو زندگی مل جاتی ہے خدا کرے یہ زندگی میرے ساتھ ایسے ہی رہے‘‘ [۲]

روبینہ کی یہ بات درست ہے کہ اگر ایک بھی دل سے پڑھنے والا قاری مل جائے کافی ہے اگر آپ کسی بزم میں کوئی بات کر رہے ہیں تو آپ کو کوئی ایک دل سے سن لے یہ بات ہی کافی ہے اس دور جدید میں کسی کے پاس کسی کو سننے کے لیے وقت نہیں ہے کسی کا لکھا ہوا تو پڑھنا بہت دور کی بات ہے۔

روبینہ کو اپنے گھر سے ہی ایک ادبی ماحول مل گیا تھا جس مصنف کو شروع سے ہی ادبی ماحول مل جائے اس کو اور کیا چاہیے جن لوگوں کو شروع سے ادب کی انگلی پکڑ کر چلنے کا موقع مل جائے، وہ لوگ دنیا میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں کیوں کہ وہ حیات رہنے کے لیے کچھ الفاظ سپرد قرطاس کر جاتے ہیں آج بھی وہ لوگ الفاظ میں زندہ ہیں جن نے اپنے جذبات و احساسات کو لفظوں میں پرو دیا۔ جن لوگوں کا تعلق قلم و قرطاس سے ہوتا ہے وہ لوگ مرتے نہیں ہیں وہ موت کے بعد بھی زندہ ہی رہتے ہیں۔

روبینہ کا تعلق بھی قلم وقرطاس سے بہت گہرا ہے روبینہ کا ادب کو لکھنا پڑھنا شاید اس لیے ممکن ہوا تھا آپ کے والد محترم ایک سکول ٹیچر تھے۔

روبینہ والد کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ”میرے ابو نے ہمیشہ میری تحریروں کو غور اور شوق سے پڑھا میری حتی الامکان اصلاح کی، وہ سکول ٹیچر اور اچھے مقرر تھے، مزاج محبت اور جذباتیت کے ساتھ ساتھ ابو سے یہ صلاحیتیں بھی لے لیں ان کا سایہ ہمارے سر پر ہمیشہ رہے گا۔“ [۳]

اُن کے پہلے قاری اور اصلاح کرنے والے اُنکے والد دوست بہن بھائی تھے۔ روبینہ کا قلم سے رشتہ بہت پرانا ہے صدیوں کا رشتہ موت کے بعد بھی یاد رکھا جاتا ہے۔

روبینہ فیصل نے اب تک بہت سی کہانیاں کالم لکھ کر اردو ادبی دھارے میں اپنے آپ کو منوا لیا ہے ان نے اپنے افسانوں میں معاشرتی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

اصغر ندیم سید لکھتے ہیں:

> ”ہر افسانہ اچھوتے مسلے کو سادہ اور سچے بیانیہ کے ساتھ پیش کرتا ہے جس سے تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ روبینہ فیصل کا یہی انداز ہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے کہ یہ افسانے خود کو پڑھواتے ہی۔ ہر کہانی آپ کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ اہم بات یہی ہے کہ آج کی عصری حسیت ان افسانوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ افسانے آج کے انسانی معاشرے کی بے شمار کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ روبینہ فیصلہ کی سچائی اور بے باکی نے ان افسانوں کو اردو کے فکشن میں ایک نئی جہت فراہم کر دی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس فن میں نئی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ہاں کہانی پر گرفت بہت بڑے تجربے کا پتہ دیتی ہے میں انہیں ان افسانوں کے اچھوتے موضوعات اور بنت کاری پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“ [۴]

روبینہ فیصل نے شروع سے ہی لکھنے کو ترجیح دی جو قابل داد ہے ان کے اس شوق نے ان کو اور بھی لکھنے پر مجبور کیا انہوں نے زمانہ طالب علم میں ہی تقریری مقابلہ جات میں شرکت کرنا شروع کر دی تھی ان کا بچپن وہاں

گزرا جہاں پر قلم و قرطاس کی دوستی کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ان کی شخصیت سازی پختہ اور مضبوط بنانے میں ان کے والد کا ہاتھ ہے جو قدم قدم پر ان کی اصلاح کرتے اور ان کی لکھی ہوئی تحریروں کو سراہتے اگر کوئی اصلاح کی گنجائش ہوتی تو کرتے۔

باقاعدہ ادبی سفر:

انہوں نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز اس وقت کیا جب انہوں نے ایک ہفتہ وار اردو اخبار میں شمولیت اختیار کی اور پھر انہوں نے ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کر دیئے ان کا پہلا کالم جنرل ضیاء الحق پر شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے ضیا کا موازنہ ذوالفقار علی بھٹو سے کیا تھا انہوں نے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کالم میں اپنے خیالات و مشاہدات کو قلم بند کیا۔ اس کالم میں انہوں نے لوگوں کو اپنے خیالات سے متفق ہونے پر زور نہیں دیا بلکہ انہوں نے لوگوں کو جگہ فراہم کی جو سوچنا پسند کرتے تھے اور جن لوگوں میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہوتی تھی وہ خود محسوس کر سکتے تھے انہوں نے ایسا نہیں کیا کہ اپنے نظریات کو لوگوں پر تھوپ دیں بلکہ لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا۔

روبینہ ایک شاعرہ بھی ہیں لیکن بظاہر وہ اپنے آپ کو شاعرہ تسلیم نہیں کرتیں روبینہ نے مختصر کہانیاں اسٹیج ڈراموں، ٹی وی اسکرپٹ میں زیادہ لکھا ہے۔ ان کو لکھنے کا بہت شوق تھا اس خواہش نے ان کو بڑی کہانی کا نبض شناس بنا دیا۔

روبینہ لکھتی ہیں:

> ’’میرے لیے لکھنا ایک نشہ بھی ہے جس میں لذت ہے اور ایک سخت قسم کی
> مجبوری بھی ہے کہ نہ لکھوں تو جینا ناممکن ہو جائے گا۔‘‘ [۵]

انہوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ لکھنا پڑھنا ان کے لیے ایک نشہ ہے اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ وہ آج بھی اردو زبان میں کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہیں اس بات کی داد بنتی ہے کہ روبینہ نے سمندر پار بھی قلم سے رشتے کو نہیں توڑا انہوں نے دیارِ غیر میں بھی اپنے لوگوں کے دکھوں تکلیفوں کو محسوس کیا ہے یہ افسانوی کہانیاں

اصل میں حقیقی کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں اجنبیت نہیں ہونے دیتیں ان میں وہ دلکشی ہے جو قاری کو مسحور کر لیتی ہے۔

روبینہ کی کہانیوں میں ان کا گہرا مشاہدہ بولتا ہے ایسے لگتا ہے جیسے روبینہ نے ان کرداروں کو سامنے بٹھا کر کہانیاں لکھی ہیں روبینہ نے اتنی مصروف زندگی سے لکھنے کے لیے وقت نکالا ورنہ تو دیار غیر میں زندگی ویسے ہی بہت تیز ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے کسی کے پاس کسی کو پوچھنے کا وقت نہیں لیکن ان کے وقت نکال کر لوگوں کے مسائل دکھوں کو محسوس کیا یہ عمل قابل تحسین ہے اس عمل کو یاد رکھا جائے گا۔

روبینہ جہاں رہ رہی ہیں وہ لوگ پیسے کی دوڑ امیری کی دوڑ میں ہیں وہ لوگ مادہ پرست ہیں ان کو جذبات واحساسات سے کوئی سروکار نہیں وہ دل کی سننے سے قاصر ہیں اور نہ ہی اس لیے وہ کوشش کرتے ہیں اگر کبھی وہ دل کی سنیں تو قلم وقرطاس کے رشتہ استوار ہوجائے گا۔ روبینہ نے سمندر پار نہ صرف یہ کہ لوگوں کی پکار سنی بلکہ وہاں کے لوگوں کو سنا ان کے دل کی سنی پھر مداوا کیا لکھنا ان کے خون میں شامل تھا۔

روبینہ اپنے بارے میں خود لکھتی ہیں:

> ’’جب کبھی میں سوچتی ہوں کہ خدا مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے تو بچپن سے آج تک ایک ہی جواب اندر سے آتا ہے کہانی لکھوانا چاہتا ہے‘‘[۶]

’’خواب سے لپٹی کہانیاں‘‘ روبینہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے اس مجموعے کے اندر معاشرے میں بکھرتے ہوئے دکھ، درد تکلیفوں کو انہوں نے ایک کتابی صورت دی ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس افسانوی مجموعے میں زندگی کے مختلف موضوعات کو اکٹھا کیا گیا ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔

روبینہ خود اس مجموعہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ’’خواب سی لپٹی کہانیاں‘‘ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے ان میں محبت ہے ڈھیروں خواب ہیں۔ موت ہے، جدائی ہے، بے وفائی ہے اور وقت کی ستم ظریفی ہے یہ موضوع نئے نہیں ہیں لیکن حالات اور کردار نئے ہونے کی وجہ سے مجھے ہر کہانی نئی لگی ہے۔ میں ڈر کر یا دب کر یا ڈپلومیسی سے نہیں لکھنا چاہتی تھی۔‘‘[۷]

روبینہ نے دل سے لکھا ہے جو محسوس کیا ہے اس کو بیان کرنے میں شرمندگی اور ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی، کسی بھی لکھنے والے کو کبھی اس سے گریز نہیں کرنی چاہیے نہ وہ لکھنے میں دوہرا معیار رکھے اس کو چاہیے کہ وہ جو لکھے وہ حقیقت اور اصل ہوں ایسا نہ ہو کہ وہ جو کچھ لکھے وہ حقیقت سے ماورا ہوں قاری کے لیے مشکل ہوتی ہے جو چیز قاری کی دانست پر گراں گزرے وہ اس کو نظر انداز کر دیتا ہے اسے لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں جس کو قاری اس لیے چھوڑ دے کہ وہ اس کی سمجھ سے بالا تر ہے۔ روبینہ نے جو کچھ لکھا وہ حقائق کی روشنی میں لکھا ہے ایسا نہیں لگتا کہ وہ حقائق کو مسخ کر کے لکھا گیا ہے ادب کی دنیا میں وہ لکھاری ہی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں جو اپنی کہانی اور تحریروں کو معاشرے کی کوکھ سے کرید کر تحریری صورت دیتے ہیں تا کہ قاری جب کبھی پڑھے تو اس کو لگے کہ یہ غیر حقیقی نہیں یہ حقیقت نگاری ہے اگر قاری کو شائبہ ہو جائے کہ یہ کردار یہ کہانی تیسری دنیا سے تو وہ اگر پڑھے بھی تو دلچسپی کھو کر ہی پڑھتا ہے اس سے قاری ابہام اور شبہات کی نظر ہو جاتا ہے جب بھی قاری ان چیزوں کا شکار ہو جائے تو وہ پڑھنا چھوڑ دیتا ہے کیوں کہ یہ چیز اس کی فہم و ادراک کو متاثر کرتی ہے اور یہ بات دنیا میں عیاں ہے کہ جو چیز انسان کی عقل کو شبہات میں مبتلا کر دے وہ ان کو چھوڑنے میں ایک منٹ تک کا انتظار نہیں کرتا میں یہ بات کر سکتا ہوں کہ روبینہ کے ہاں اس طرح نہیں ہے ان کا اندازہ یہاں اس قدر انوکھا اور اچھوتا ہے کہ قاری کے دل پر اثر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ پڑھتے وقت ایک بار بھی دل نے نہیں کہا کہ اب چھوڑ دو پھر پڑھوں گا۔

کسی بھی کہانی کی یہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ قارئین کو پڑھنے پر مجبور کرے اور یہ مصنف کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے مصنف کو چاہیے کہ وہ طرز تحریر اپنائے جو قاری کو پڑھنے پر مجبور کر دے۔

ادبی خدمات:

۱۔	کالموں کا مجموعہ ’’روٹی کھاتی مورتیاں‘‘	۲۰۱۰
۲۔	’’خواب سے لپٹی کہانیاں‘‘	۲۰۱۶
۳۔	’’ایسا ضروری تو نہیں	۲۰۱۸
۴۔	’’گمشدہ سائے‘‘	۲۰۱۹

۵۔ ناول نارسائی ۲۰۲۱

اگر روبینہ کے فن کے بارے میں بات کریں تو ان کا ہر افسانہ قاری کو متاثر کرنے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے روبینہ نے ہر افسانے کو اچھوتے سادہ اور سچے بیانیہ کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے تاثیر بڑھ جاتی ہے ان کا انداز ہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے ان کے افسانے خود پڑھواتے ہیں جب قاری کہانی کو شروع کرے گا تو وہ اس کو مکمل پڑھ کر ہی دم لے گا کیونکہ ان کی کہانیاں حقیقی اور دلچسپی کے لوازمات اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج کی عصری حسیت ان کے افسانوں میں رچی بسی ہوئی ہے یہ افسانے آج کے معاشرے کی بے شمار کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں روبینہ فیصل کی سچائی اور بے باکی نے ان کے افسانوں کو اردو فکشن میں ایک نئی جہت فراہم کر دی ہے ان کو اپنی کہانی پر پوری گرفت ہے ان کی کہانیاں بتاتی ہیں کہ وہ کس قدر کہانی کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔

اختر شمار رقم طراز ہیں:

> ''روبینہ فیصل اگر ریاضیت کی انگلی تھامے رکھی تو جلد وہ قدآور کہانی کاروں میں
> شمار ہوں گی۔'' ۸

روبینہ فیصل افسانوی دنیا میں یاد رہیں گی کیونکہ انہوں نے سمندر پار بیٹھ کر انسانی دکھوں، تکلیفوں، کرب ناکیوں کو محسوس کیا ہے وہ بے مثل ہے ان کے افسانے پڑھتے ہوئے ذرا برابر بھی محسوس نہیں ہوتا کہانیاں سمندر پار انسانوں کی ہیں یا اس دیس کی ہیں یہ کہانیاں دونوں معاشروں کی نمائندہ ہیں یہ تمام کہانیاں ہمارے معاشرے کی ہیں جس میں حیات کے روز شب گزار رہے ہیں یہ کہانیاں قاری کو اپنے حصار میں لینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ کہانیاں قاری کو اپنی کہانیاں اپنے واقعات لگتے ہیں۔

روبینہ نے اپنے افسانوں میں سادہ اسلوب عام فہم زبان کو اپنایا ہے یہ کہانیاں اس قدر تسلسل اور روانی کے ساتھ چلتی ہیں کہ قاری کو اپنی گرویدہ کر لیتی ہیں۔

اصغر ندیم سید رقم طراز ہیں:

> ''روبینہ فیصل نے ان دو مختلف جہانوں کی زندگی میں ایسے کردار اور مسائل

> دریافت کیے ہیں جو ہماری سماجی مجبوریوں، کمزوریوں اور اجتماعی بے حسی کو سامنے لاتے ہیں میرے لیے خوشگوار تجربہ دوطرح سے رہا ہے۔ ایک تو زندگی کے نسبتاً چھپے ہوئے گوشوں کو بے حد حساس طریقے سے چھونے کی کوشش کی گئی ہے دوسرا کہانی کے فن کی تمام باریکیوں اور بیانیہ کی طاقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سچے اور کھرے اسلوب کا انتخاب کیا گیا ہے زندگی کے بے تکلفانہ برتاؤ نے ان افسانوں کی فضا میں بے ساختگی اور بے باکی کو رچاؤ بخشا ہے“[۹]

روبینہ کے ہاں کوئی مشکل پسندی نہیں ہے انداز بیاں بھی قابل فہم ہے ہمارے بہت سے لکھاری ہیں جو مشکل الفاظ بھری بھرکم تراکتب کا استعمال بے جا کرتے ہیں جو پڑھنے والوں کے لیے بہت مشکل کا سبب ٹھہرتی ہیں کسی بھی لکھاری کو چاہیے کہ لکھتے وقت اپنے قاری کی زبان کا خیال رکھے تاکہ اس کی بات زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں کسی بھی مصنف کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہی ہوتی ہے کہ اس کی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ ایسی کتاب کا کیا فائدہ جو قاری اس وجہ سے چھوڑ دے کہ پتہ نہیں مصنف کہنا کیا چارہا ہے ایسی کتابیں ہمیشہ دھری رہ جاتی ہیں۔ میرے خیال میں کوئی بھی لکھنے والا اس وجہ سے بڑا نہیں ہوجاتا اس کے ہاں سب سے مشکل زبان کا استعمال ہے بھاری بھرکم تراکیب کا زیادہ استعمال ہے یہ بس ایک ذہنی اختراع ہے جو حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

مصنف کو چاہیے کہ وہ زبان اختیار کریں جو اس کے قاری کو آتی ہو اور وہ اپنے مصنف کی بات کو سمجھ سکے اب اگر میں روبینہ کے انسانوں کی زبان کی بات کروتو وہ زباں عام فہم ہے اس میں ذرا برابر بھی پیچیدگی نہیں جو قاری کی سماعتوں پر گراں گزرتی ہو روبینہ نے اسلوب میں وہ چاشنی ہے جو قاری کا دل موہ لیتی ہے۔

اُن کے بعض افسانے تین چار صفحات پر مشتمل ہیں لیکن کہانی پوری کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس قدر کھل کر قارئین کے ذہن پر واضح ہوجاتے ہیں کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے افسانوں میں دلکشی اور معنویت کی وہ گہرائی ہے جو قاری کو چھو جاتی ہے روبینہ کے بعض اتنے مختصر جملے ہیں لیکن اپنے اندر پوری کہانی لیے ہوئے ہیں۔

اقتباس دیکھیے:

> ''اپنے لیے جیو۔۔۔ پہلے اپنا اپ پھر کچھ اور یا کوئی اور۔۔۔ خود خوش اور مضبوط ہوگی تو باقی کی دنیا عزت کرے گی ورنہ سب پیروں تلے روند دیں گے''[۱۰]

چھوٹے چھوٹے جملے اس قدر گہری بات سے بھرپور ہیں کہ قاری کے دل تک کا سفر پل بھر میں طے کر لیتے ہیں۔

> ''شیرنی بن شیرنی۔۔۔ ورنہ تیرا کالج تجھے کھا جائے گا کالج سے بچ گئی تو باہر کی دنیا تجھے کھا جائے گی۔''[۱۱]

مذکورہ جملوں سے انداز لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح جملوں میں کہانی کہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں روبینہ نے معاشرے کی حقیقت کو دیکھا اور اس کو اپنے افسانوں میں بیان کیا کوئی افسانہ ایسا نہیں جس میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہو ورنہ بعض تو ادیب ایسے ہوتے ہیں جو حقیقت کو دفن کر کے خود سے کہانیاں تراشنے لگ جاتے ہیں جو بہت جلد ہی ناپید ہو جاتی ہیں قاری جب کوئی کہانی پڑھتا ہے وہ اپنے اطراف میں دیکھتا ہے کہ اس طرح کے مسائل اور کردار موجود ہیں حقیقی کہانیاں دیرپا ہوتی ہیں وہ ادبی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں کیونکہ وہ کہانیاں آفاقی ہوتی ہیں ان میں عالمگیریت ہوتی ہے وہ پوری دنیا کے انسانوں کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہیں پوری دنیا کے لوگ ان سے سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں اصل میں معاشی سماجی مسائل تو تمام انسانوں کو درپیش ہیں کردار تبدیل ہوسکتا ہے لیکن مسائل تو ایک طرح کے ہیں۔

اگر روبینہ کی بات کی جائے تو ان کی کہانیاں سمندر پار لکھی گئی ہیں لیکن وہ اجنبیت نہیں ہونے دیتیں یہ کہانیاں ہمارے اپنے سماج کی عکاس اور آئینہ دار لگتی ہیں اور ان کہانیوں کے کردار بھی اجنبی نہیں لگتے یہ کردار ہمارے معاشرے کے کردار ہیں یہ ہمارے سماج کی گلیوں میں ہی حیات گزرتے نظر آتے ہیں روبینہ کے سارے کردار سماج کے زندہ کردار ہیں۔

محمد فاروقی عرفی رقم طراز ہیں:

> ''روبینہ فیصل کے افسانوں کا مجموعہ میرے روبرو ہے روبینہ کینیڈا میں مقیم ہیں

> جہاں دنیا کے دیگر بہت سے مما لک کے لوگ آباد ہیں وہاں کی معاشرت رہن سہن، تہذیب و ثقافت اور طرز زندگی قدرے مختلف اور جدا سہی لیکن دنیا کے گلوبل ویلج کا روپ دھار لینے کے بعد اب اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ روبینہ کے افسانوں میں کینیڈا کا تذکرہ پڑھتے ہوئے یہ خیال نہیں آتا کہ یہ افسانے سمندر پار کا سفر کر کے ہم تک پہنچے ہیں۔''[۱۲]

انہوں نے اپنی کتاب ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے پاکستان اور کینیڈا میں بکھری اپنے لوگوں کی کہانیاں ہی اکٹھی کی ہیں جو مجھے بہت تنگ کرتی تھی بعض اوقات میں سو بھی نہیں سکتی تھی ایک ادیب کی فکری بالیدگی اس کے معاشرے کی گہرائیوں سے شروع ہوتی ہے اس میں بکھرے ہوئے مسائل کو محسوس کرنا ان کو زبان دینا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن روبینہ نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔

روبینہ فیصل نے اگرچہ دو معاشروں سے یہ کہانیاں تراشی ہیں میں یوں کہوں گا ان کے یہ کردار دو معاشروں کے حسین امتزاج کا ثمر ہیں ہم ان افسانوں کو دنیا کے کسی بھی معاشرے میں بیٹھ کر پڑھ لیں آپ ان کو اجنبی نہیں پائیں گے اپ ان سے کبھی بھی بیزار اور اکتائیں گے نہیں ان میں ایک خاص قسم کی دلکشی ہے جو قاری کو اس قدر محسوس ہوتی ہے کہ وہ بس قاری ہی جان سکتا ہے کوئی بھی انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو اگر وہ کبھی فرصت کے لمحات میں ان کرداروں سے ملے تو وہ ان کو حقیقی پائے گا وہ کہے گا یہ کردار میری گلی کے ہیں یہ باتیں تو میرے معاشرے کی ہیں جو روبینہ بتا رہی ہیں۔

روبینہ فیصلہ قلم تھام کر اس لڑکی کی جیسی ہوجاتی ہیں۔ جس کو لفظ قرطاس پر آنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔

روبینہ کی کہانیوں کا متن فکشن کی زبان کے اصولوں پر پورا اترتا ہے۔ رواں اور سلیس، کہیں الجھاؤ یا رکاوٹ کا شکار نہیں ہوتا جو قاری کی ادراک پر حملہ تصور ہو بلکہ قاری کے ذہن کے گوشوں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوجاتا ہے واقعات اپنے بہاؤ میں بستے چلے جاتے ہیں اور قارئین کو اپنے قافلے میں شامل کرتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اجمل خاں نیازی رقم طراز ہیں:

> ''روبینہ فیصل ایک مختلف اور ممتاز افسانہ نگار ہیں بلکہ میں اسے ایک گمشدہ افسانہ نگار کہوں گا جسے اردو ادب نے تلاش کر لیا۔'' ۱۳؎

روبینہ فیصل افسانوی ادب میں ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اردو میں دو افسانوی مجموعوں کو اتارا۔ روبینہ نے سماج کی ایک طرح سے نمائندگی کی ہے انہوں نے قلم سے دوستی کر کے وہ کچھ الفاظ میں بتایا جو تادیر پڑھا جائے گا اگر انہوں نے جہد مسلسل کو جاری رکھا تو ایک وقت آئے گا کہ جب وہ قد آور افسانہ نگاروں میں شمار ہوں گی مغربی دنیا میں بہت سے ایسے لوگ رہتے ہیں جو اردو زبان سے دل و جان سے بھی کہیں زیادہ محبت کرتے ہیں ان کے دلوں میں اردو نے گھر بنا لیا ہوا ہے بلکہ میں تو کہوں گا انہوں نے اردو کے دل میں اپنی مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ ان میں سے ایک روبینہ بھی ہیں جو دیار غیر میں بھی اردو سے اتنی ہی محبت کرتی ہیں جتنی کہ ایک ماں اولاد سے کرتی ہے چاہے وہ اس کی بانہوں میں ہو یا حالت جنگ میں ہو۔ دنیا میں ایک واحد ماں کا رشتہ ہے جو بے لوث، بے نیاز ساری دنیا کی پروا کیے بغیر محبت سے سرشار اور بھرپور رشتہ ہے دیار غیر کے لوگوں نے اردو سے بھی ایک ماں کی طرح محبت کی ہوئی ہے۔ وہ سمندر پار بھی اپنی ماں کے لوگوں کے دکھ درد سے واقف ہیں بعض کو تو اپنے وطن کی محبت دیار غیر کی چوکھٹ پر بسنے تک نہیں دیتی لیکن کچھ حالات اور وقت کے تقاضے ایسے ہوتے ہیں ناچاہتے ہوئے بھی وہاں پر رہنا پڑتا ہے جس طرح سے روبینہ نے ہجرت کی اور دیار غیر میں جا کر سانس لی۔ یہ سب حالات کا ایک بڑا فیصلہ نظر آتا ہے دنیا کا سب سے مشکل کام اپنی خواہش کو دفن کرنا اور خود حالات کے زیر عتاب آ جانا ہے لیکن روبینہ کے افسانوں میں یہ احساس بالکل بھی نہیں ہوتا کہ وہ وطن سے کوسوں دور ہیں ایسے ہی لگتا ہے انہوں نے اپنے دیس کی ہی کہانیاں تحریر کی ہیں۔

اگر یہ کہوں تو بے جا نہیں ہوگا کہ وطن عزیز کی محبت نے زندہ رکھا ہوا ہے کیونکہ وہ اپنے جذبات و احساسات کو اس زبان میں لکھ لیتی ہیں اس عمل سے ہی ان کے جذبات کو تسکین ملتی ہے۔

آپ لکھتی ہیں:

> ''کہانیوں کے اس سفر میں میری ذات کو درپیش سفر بھی شامل ہے'' ۱۴؎

یہ بات درست ہے کہ وطن سے دوری کا دکھ اتنا بڑا دکھ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی تمام خوشیوں کے باوجود انسان کے دل میں بیٹھ جاتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ دل کی گلیوں میں رہائش پذیر ہو جاتا ہے پھر وہ کبھی بھی نقل مکانی نہیں کرتا۔ بلکہ اس وقت تک ساتھ رہتا ہے جب تک انسان جہاں آباد کو خیر آباد نہ کہہ دے۔ یہ دکھ دل کے ایک خانے میں گھر بنا لیتا ہے جس سے وہ کبھی بھی نہیں نکلتا وہ زندگی کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے جب تک انسان زندہ ہے وہ بھی مسائل دکھ، غم زندہ ہیں روبینہ نے ہجرت کے دکھ کو چھوڑ کر اپنے لوگوں کے مسائل دکھوں کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔

روبینہ فیصل نے سچائی اور حقیقت نگاری کو تحریر کرتے ہوئے انصاف برتا ہے کبھی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کیا انہوں نے جو کچھ لکھا دل سے اور انصاف کے ساتھ لکھا ہے روبینہ نے کبھی حقائق کو مسخ کر نہیں لکھا بلکہ حقائق کی روشنی میں لکھا ہے لکھاری کو چاہیے کہ وہ جو سپرد تحریر کرنے وہ حقائق کی روشنی اور سچائی کو مد نظر رکھ کر لکھے کیونکہ کہ دوام صرف صداقت کو ہے صداقت کو بالائے طاق نہیں رکھنا چاہیے کیوں کہ یہ مصنف کی ذات پر سوال ہوگا روبینہ نے جو کچھ بھی لکھا ہے حقیقی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور حقائق پر مبنی چیزیں ہی دیرپا رہتی ہیں۔

آپ اپنے کالموں کے مجموعہ میں لکھتی ہیں:

> ”اپنے حصے کا کام ہے جو مجھے کرنا ہے میں نہیں جانتی اس سے کچھ فرق پڑ رہا ہے یا نہیں مگر یہ میرا پختہ یقین ہے کہ سچائی خوشبو کی طرح پھیلتی ہے میرے حصے کا دیا میرے ہاتھ پر دھرا ہے اور مجھے اسے جلائے رکھنا ہے، اس کوشش میں چاہیے میری ہتھیلی جلتی جائے۔“[۱۰]

روبینہ کی یہ بات اُن کے افسانوں پر بھی صادق آتی ہے ان کے افسانے بھی سچائی کا پرچار ہی کرتے ہیں اُنہوں نے افسانوں میں بھی سچائی کو ہی بیان کیا ہے انہوں نے افسانوں میں سچائی کا ہاتھ تھام کر سفر کیا ہے۔ حقائق کی کرچیوں کو اکٹھا کر کے خون جگر سے گل افشاں کیا ہے روبینہ نے حقائق کی روشنی میں دیکھا اور اس روشنی تلے بیٹھ کر لفظوں کا سہارا لے کر قاری سے باتیں کیں روبینہ نے جو تحریر کیا وہ انسانوں کے مسائل سوچ، حقائق کا مجموعہ ہے۔

انہوں نے مبالغہ آمیز گفتگو سے گریز کی ہے اُن کے فن کا یہ بہت ہی دلکش اور حسین پہلو ہے جس کو انہوں نے بڑی چابکدستی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں انہوں نے کامیابی بھی پائی ہے۔ ان کے افسانے قاری کو پڑھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

علامہ عبد الستار عاصم لکھتے ہیں:

> ''روبینہ کے افسانے قاری کے دل کی دھڑکنوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور فکر و خیال کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں'' [۱۶]

امجد اسلام امجد لکھتے ہیں:

> ''وطن اور ادبی مراکز سے دوری کے باوجود روبینہ نے جس طرح سے اپنی مہکی دنیا کے مانوس اور کچھ کنیڈا کے شب و روز کے مخصوص گوشوں کو دیکھا اور دکھایا ہے وہ بلاشبہ داد تحسین اور گہرے مطالعے کے لائق اور حق دار ہیں۔'' [۱۷]

''گمشدہ سائے'' روبینہ فیصل کا دوسرا افسانہ مجموعہ ہے جو اردو افسانوی دنیا میں ایک اضافہ ہے جس کو اردو سے تعلق رکھنے والے قارئین یاد رکھیں گے کہ سمندر پار بیٹھی ایک مصنفہ نے افسانوی کتاب لکھی تھی۔

اس کتاب میں بیان کردہ واقعات ہمارے اپنے واقعات ہیں پیش کردہ مسائل ہمارے مسائل ہیں بیان کردہ مسائل معاشرے کے بنیادی مسائل ہیں جن سے ہم کسی بھی صورت منہ نہیں پھیر سکتے روبینہ نے جس طرح سے لوگوں کے مسائل کو محسوس کیا اور پھر الفاظ میں ڈھال دیا اس عمل کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اس جدید دور میں کسی کے پاس انسانی مسائل کو محسوس کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں روبینہ نے ان مسائل کو صرف اجاگر ہی نہیں کیا بکہ لوگوں کو بتایا بھی ہے کہ یہ انسانی مسائل رافع کرنے کی ضرورت ہے روبینہ کی کی ساری کہانیاں اپنے اندر طرح طرح کے سبق لیے ہوئے ہیں یہ کہانیاں قاری کو صرف پڑھنے پر مجبور ہی نہیں کرتی بلکہ انسانی زندگی کو پیش مسائل کو دور کرنے کے لیے تیار بھی کرتی ہیں اور قاری کی اصلاح بھی کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں سبق آمیز بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

علامہ عبد الستار عاصم لکھتے ہیں:

> ''گمشدہ سائے کے افسانے ہمارے معاشرے کی زندہ اور حقیقی کہانیاں ہیں
> روبینہ فیصل کی کہانیوں کے کردار ہمارے آس پاس چلتے پھرتے سانس لیتے،
> ہنستے روتے اور جیتے جاگتے کردار ہیں۔'' [۱۸]

روبینہ نے جن موضوعات کو قلم بند کیا ہے وہ ہمارے سماجی مسائل ہیں مثلاً لالچ، مرد اور عورت کے تعلقات کی پیچیدگیاں، جذبات واحساسات کے دکھ، ازدواجی المیے، جھوٹ فریب نا انصافی موت، بے رحمی بھوک کا دکھ، بے وفائی، احساس محرومی، احساس کمتری یہ سب اُن کے موضوعات ہیں جن کو روبینہ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

روبینہ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا یہ بات اُن کے افسانوں میں بھی واضح ہے کالموں میں بھی واضح دیکھی جاسکتی ہے اس میں کوئی دورائے نہیں ہے جو لوگ زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دنیا میں باقی رہتے ہیں کیونکہ وہ ان مسائل کو اپنا جان کر ان کو سدھارنے کے لیے کوشش کرتے ہیں خواہ وہ اس میں ناکام رہ جائیں لیکن وہ جدوجہد کرتے ہیں۔

روبینہ کا قلم ایک نشتر اور ہاتھ ماہر جراح کا ہاتھ ہے جو معاشرے کے جسم سے لپٹے ہوئے سماجی رسم و رواج خوف نا انصافیوں اور بے وفائیوں کا بڑی بہادری دلیری کے ساتھ آپریشن کرتی ہیں انہوں نے اس عمل میں کوئی رعایت نہیں برتی بلکہ پوری ایمانداری دیانتداری کے ساتھ معاشرے کے مسائل کی روداد اپنے افسانوں میں تحریر کی ہے۔

''گمشدہ سائے'' میں انہوں نے عورتوں کے مسائل اور کیفیات کو بہت قریب سے دیکھا ہے کوئی لکھنے والا گہرے مشاہدے تجربات کے بغیر کچھ اچھا نہیں لکھ سکتا روبینہ نے عورت کو درپیش مسائل کو بیان کرتے ہوئے اس کو آئینہ دکھانے میں بھی کوئی رعایت نہیں برتی۔ ایک عورت ہونے کے ناطے عورت کی بے وفائیں، چالاکیاں، دونمبریاں نقابوں میں چھپے چہرے کو معاشرے میں بے نقاب کرنا اور ان کا اصل چہرہ دکھانے میں انہوں نے انصاف اور نیک نیتی کا ثبوت دیا ہے۔ اس دور میں سچ کا ساتھ دینا بہت مشکل ہے ایسا کوئی بھی نہیں جو سچائی کا ساتھ دے اور خلوص، نیت کے ساتھ سچائی کو لکھے اور معاشرے کو اس کا بھیانک چہرہ دکھائے آج کل ہر

بندہ وہ لکھ رہا ہے جو اس کا دوسروں سے زیادہ بک رہا ہے بہت کم لوگ ہیں جو حقیقت اور حق کے ساتھ کھڑے ہونے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن روبینہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ حق سچ کے ساتھ ہیں جو کچھ بھی لکھیں گی وہ سچ ہوگا اس میں مبالغہ آرائی اور مصنوعی باتیں نہیں ہوں گی جن کا حقیقت سے تعلق نہ ہو۔

”گمشدہ سائے“ کے بارے میں پروفیسر قیصر رضا لکھتے ہیں:

> ”ان کے موضوعات ان کے لیے دل کی آوازیں ہیں وہ ایک مشن سمجھ کر ان آوازوں کو لفظوں کا پیرہن پہنا کر پیش کرتی ہیں تاکہ ہمارے معاشرے کے گمشدہ سائے، سائے نہ رہیں بلکہ یہ جیتے جاگتے کردار بن کر اس طرح ہمارے سامنے آجائیں کہ ان کو سنے بغیر ہمارے پاس کوئی چارہ نہ رہے وہ ان سایوں کو مکمل انسان ثابت کر دینا ہی کافی نہیں سمجھتی بلکہ وہ ان کو ان کی جبری گمشدگی سے باہر لا کر معاشرے کے روبرو کرنا چاہتی ہیں تاکہ معاشرہ اپنے آپ کو پہچان سکے“[۱۹]

روبینہ نے دور حاضر کی سماجی انصافیوں کے مارے لوگوں کی چیخ و پکار کو سنا ہے یہ جب کہ مشکل کام ہے لیکن انہوں نے کہا ہے تب جا کر گمشدہ سائے جیسی کتاب ادبی دنیا کے آسمان پر طلوع ہوتی ہے روبینہ کے افسانوں کے کرداروں کی صورت و سیرت اور پیکر تراشنے کے لیے خام مواد انہوں نے اپنے معاشرے سے لیا ہے اسی لیے یہ پیکر اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے ایسے ہی لگتا ہے کہ جیسے بہت پہلے سے جان کاری اور گہری رفاقت کا رشتہ ہے۔

ان کہانیوں میں جو قاری کی اصلاح کے لیے روبینہ نے تدریسی فرائض انجام دیے ہیں وہ قابل تحسین ہے کیونکہ لکھاری کو چاہیے کہ وہ جب بھی کہانی تحریر کرے تو وہ اصلاحی پہلو کو لازمی یاد رکھے میرے خیال میں اصلاحی پہلو بھی قاری کو پڑھنے کی طرف راغب اور متوجہ کرتا ہے بلکہ کہانی قاری کے دل پر نقش ہو جاتی ہے روبینہ کی کہانیوں میں وہ صلاحیت و جرات ہے کہ جو قاری کے دل پر دستک دے اور قاری دروازہ کھولنے پر مجبور ہو جائے۔

محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

> ''روبینہ فیصل کہانی کہنے پر اور قاری کی پوری توجہ ہتھیا کر اسے اپنی کہانی سے وابستہ کر لینے پر قادر ہیں۔'' [۲۰]

اس میں کوئی دورائے نہیں مصنف کی یہ بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ قاری کو اپنے لکھے ہوئے کو پڑھنے پر مجبور کر دے اور یہ کام اس صورت ممکن ہوتا ہے جب لکھاری اپنے قاری کی نفسیات اور خواہشات سے پوری طرح آ گاہ اور واقفیت رکھتا ہو۔

قاری ان چیزوں کی طرف کم مائل ہوتا ہے جو اس کے اندر سوچنے اور تجسس کی چنگاری کو ہوا نہ دے۔ روبینہ کے تمام افسانوں کا یہ بڑا پن اور خصوصیت ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود پڑھواتے ہیں اور یہ خصوصیت کی بھی مصنف کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔

''خواب سے لپٹی کہانیاں'' روبینہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۰۱۶ء میں اشاعت کے مراحل طے کر کے قارئین کے ہاتھ میں آیا اور اس نے روبینہ کو افسانوی دنیا میں متعارف کروایا اس سے قبل وہ صحافتی دنیا میں اپنا نام بنا چکی تھیں لیکن اردو دنیا میں ان کی شناخت ان کا افسانوی مجموعہ ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' بنا۔

اس مجموعہ کے بارے میں روبینہ فیصل لکھتی ہیں:

> ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے ان میں محبت ہے ڈھیروں خواب ہیں، موت ہے، جدائی ہے، بے وفائی ہے اور وقت کی ستم ظریفی ہے'' [۲۱]

''خواب سے لپٹی کہانیاں'' واقعی خواب سے لپٹی ہوئی ہیں اگرچہ روبینہ اپنے وطن سے کوسوں دوری پر ہیں لیکن وہاں رہ کر وطن سے محبت وطن عزیز کی محبت کم نہیں ہوتی۔ بعض اوقات تو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ جیسے روبینہ خود قاری کی انگلی پکڑ کر بتاتی ہیں یہ مسئلہ اس کہانی کے کردار وہاں کے رہنے والے ہیں فلاح ان کا شہر ہے روبینہ فیصل کنیڈا تھیں جب انہوں نے یہ افسانے لکھے لیکن افسانے پڑھ کر شک ہونے لگتا ہے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ افسانے اپنے وطن کی آغوش میں بیٹھ کر ترتیب دیئے ہیں یہاں کے رہنے والوں کے مسائل

اُن کو بتا رہی ہیں افسانے پڑھتے وقت ایسے ہی لگا جیسے یہ کہانیاں سمندر پار کا سفر کرتے نہیں آئیں بلکہ یہاں ہی لکھی گئی ہیں اسے لگ رہا ہے جسے روبینہ روحانی طور پر آج بھی پاکستان کی گلیوں میں اپنے لوگوں کے مسائل پوچھتی پھرتی ہیں۔

خالد شریف لکھتے ہیں:

> ''روبینہ فیصل کی کہانیوں میں پاکستان کے دیہات کی سوندھی مٹی کی خوشبو اور کنیڈا کی برفانی رت کی بوقلمونیاں ایک ساتھ جلوہ افروز ہیں وہ رہتی وہاں ہیں مگر ان کی روح یہیں کہیں کسی پنگھٹ کی سرسوں کے کھیت یا کچی پکڈنڈیوں کے ارد گرد محوخرام ہے ان تمام کہانیوں میں دونوں معاشرتوں کے تقابلی مطالعے نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ روبینہ کی فنی مہارت کی داد دیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔'' ۲۲

اس مجموعے میں سے دو افسانوں کا ذکر ضرور کروں گا ''محبت کی آخری کہانی'' اور حلال بیوی'' اس مجموعے کے یہ دونوں افسانے اپنے اندر گہری باتیں اور سبق لیے ہوئے ہیں ''محبت کی آخری کہانی'' اس کہانی کا موضوع مرد عورت کی دوستی محبت کے تعلق پر مبنی ہے اس افسانے میں اس محبت کی بات کی گئی ہے جو بہت سی آزمائشوں قربانیوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے جو بہت سے نفسیاتی مسائل اور سماجی الجھنوں میں دب کر رہ جاتی ہے دل ٹوٹ جاتے ہیں پریشانی کے بادل منڈلانے لگتے ہیں جن کی دنیا میں بے چینی سی پھیل جاتی ہے خوشیاں کوچ کر جاتی ہیں دکھ رہائش پذیر ہوجاتے ہیں۔ ایسے مواقع انسان کو توڑ دیتے ہیں۔

انسان کے تمام جذبات کیفیات کو زنجیروں سے باندھا دیا جاتا ہے ان پر قدغن لگا دی جاتی ہے اور روحیں لہولہان ہوجاتی ہیں مرد اور عورت ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں پھر دور ہوجاتے ہیں پھر قریب آتے ہیں پھر دور ہوجاتے ہیں کچھ گتھیاں ہمیشہ کے لیے الجھ جاتی ہیں اور کچھ سلجھ جاتی ہیں قربتوں، دوریوں، تکلیفوں، اذیتوں کا یہ سفر عمر بھر ساتھ رہتا ہے مذکورہ افسانہ اپنے اندر بہت سے سبق لیے ہوئے ہے۔ اگر قاری اس کو دل سے پڑھے تو وہ زندگی کے لیے بہت سے اسباق اس سے اخذ کر سکتا ہے زندگی کے بنیادی موضوعات کو روبینہ نے بہت ہی

خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے روبینہ نے دکھوں سکھوں کی ایک حسین مالا پرونے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں۔

''حلال بیوی'' اس افسانے میں ایک طرف ہمارے ظاہر کو بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے ہم معاشرے میں لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتے ہیں چہرے پر بناوٹی پردے اوڑھ کر اور دوسری طرف یہ کہانی اُن لوگوں کے باطن کو بے نقاب کرتی ہے جو بظاہر اپنے آپ کو اسلام کا خدمت گزار پیروکار ثابت کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں لیکن اندر سے وہ ہوس، مطلب پرستی شیطانی خواہشات، کے غلام ہوتے ہیں روبینہ نے ایسے لوگوں کے چہروں سے نقاب گرانے کی کوشش کی ہے تاکہ معاشرے میں رہنے والے سادہ لوگ اُن کی اصلیت سے واقف ہوسکیں۔ ان کا بے باک قلم معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتا ہے روبینہ اپنے قاری کو بتاتی ہے کہ معاشرے کے معصوم سادہ لوگ کیسے مطلب پرست مفاد پرست لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور کس طرح سے اپنی ہنستی بستی زندگی میں دکھوں کو راہ دے دیتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے برباد ہوجاتے ہیں ایسے لوگ معاشرے کی ساخ کے لیے خطرہ ہیں جو انسانی زندگی میں مشکلات کو پیدا کریں۔

مفاد پرست لوگوں کی معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے ایسے لوگ انسانوں کی زندگیوں میں مسائل پیدا کرتے ہیں بعض اوقات تو زندگیوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

روبینہ نے اپنے قاری کو بتایا ہے کہ ایسے لوگوں کو جتنا جلدی ہو سکے پہچان لو ورنہ یہ لوگ زندگی کے لیے کسی خطرے سے کم نہیں ہیں۔

روبینہ فیصل نے کسی تصنع، تکلف یا بناوٹ سے کام بالکل نہیں لیا بلکہ بے ساختگی سے جو دیکھا پیش کیا انہوں نے دل لگی، پورے خلوص کے ساتھ چیزوں کو پرکھا اور پھر جا کر سپردتحریر کیا بے ساختگی اور خلوص کسی بھی تحریر کا اصل اثاثہ ہوتے ہیں ان کی کہانیوں میں یہ خوبیاں موجود ہیں کہانیوں کے موجودہ ڈھیر میں ان کی کہانیاں بھی خاص مقام کا تعین کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔

روبینہ کہانیوں میں وہ اہلیت ہے جو آنے والے سالوں میں بھی انسانی زندگی کو درپیش مسائل کی نمائندگی کر سکیں گی انہوں نے جن مسائل اور کیفیات کو قلم بند کیا ہے یہ مسائل دکھ شاید اس طرح ہی رہیں گے بس کردار چہرے بدل جائیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ روبینہ فیصل، وٹس ایپ میسج بنام راقم، ۲۰ جون ۲۰۲۵

۲۔ روبینہ فیصل، خواب سے لپٹی کہانیاں، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۱۶، ص: ۱۱

۳۔ ایضاً، ص:

۴۔ روبینہ فیصل، گمشدہ سائے لاہور، قلم فاؤنڈیشن، ۲۰۱۹، ص: ۱۲

۵۔ ایضاً، ص: ۷

۶۔ روبینہ فیصل، خواب سے لپٹی کہانیں، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۱۶، ص: ۱۰

۷۔ ایضاً، ص: ۱۰

۸۔ روبینہ فیصل، گمشدہ سائے، لاہور، قلم فاؤنڈیشن، ۲۰۱۹، ص: ۱۹

۹۔ ایضاً، ص: ۱۱

۱۰۔ ایضاً، ص: ۱۶۲

۱۱۔ ایضاً، ص: ۹۷

۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۷

۱۳۔ ایضاً، ص: ۱۴

۱۴۔ روبینہ فیصل، خواب سے لپٹی کہانیاں، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۱۶، ص: ۹

۱۵۔ روبینہ فیصل، روٹی کھاتی مورتیاں، لاہور، قلم فاؤنڈیشن، ۲۰۱۰، ص: ۲۵

۱۶۔ روبینہ فیصل، گمشدہ سائے لاہور، قلم فاؤنڈیشن، ۲۰۱۹، ص: ۲۵

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۳

۱۸۔ ایضاً، ص: ۲۵

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۹۶

۲۰۔ ایضاً، ص:۱۵

۲۱۔ روبینہ فیصل، خواب سے لپٹی کہانیاں، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۱۶، ص:۱۰

۲۲۔ فیصل فارانی، ”روبینہ فیصل کی خواب سے لپٹی کہانیاں۔۔۔“

https://www.mukaalma.com/54037/

☆☆☆

باب دوم:

روبینہ فیصل کے افسانوں کا کرداری مطالعہ

روبینہ فیصل کے افسانوں کا کرداری مطالعہ

کسی بھی کہانی کو آ گے بڑھانے میں کردار لازمی ہوتے ہیں اگر کردار نہ ہوں تو کہانی ایک قدم بھی آ گے نہیں بڑھ سکتی۔ ان کرداروں کی نفسیات اور مکالمہ کا امتزاج قاری کے دل کی گہرائیوں میں جا کر سانس لینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ قاری کو جو چیز سب سے زیادہ کہانی کو پڑھنے پر قائل کرتی ہے وہ اس کے کردار نگاری کی پختگی اور گفتگو ہے اگر کردار مضبوط اور جاندار ہوں تو قارئین کی بہت بڑی کھیپ پیدا ہو سکتی ہے اور قارئین کی بہت بڑی تعداد ان کی کہانیوں سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اب یہ بات مصنف پر ہوتی ہے کہ وہ کس طرح کے کردار اپنے تخیل میں لا کر ان کو بہتر سنوار کر قرطاس پر سجاتا ہے اگر کردار اچھے اور متاثر کن ہو تو قاری میں پڑھنے کی ایک بہت بڑی امنگ خواہش کو جنم دے سکتے ہیں میں تو کہتا ہوں مصنف کو چاہیے کہ وہ کردار حقیقی دنیا سے کشید کرے۔ اگر کوئی کردار تیسری دنیا سے ہوگا تو وہ قارئین کو اس طرح سے متاثر اور اسیر نہیں کر سکتا جس طرح سے حقیقی کردار کرتے ہیں۔

کچھ افسانے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں کوئی کردار ایسا موجود نہیں ہوتا جو سارا ماجرا کہہ رہا ہو۔ جب آپ توجہ سے دیکھیں تو آپ پر کھلے گا کہ جو کہانی بیان کر رہا ہے وہ خود کہانی کا حصہ ہے ایسے افسانے صیغہ واحد متکلم میں لکھے جاتے ہیں راوی کردار چوں کہ ''میں'' کہہ کر ساری کہانی قارئین تک پہنچا تا ہے۔ یہ بات صرف مصنف پہ ہے کہ وہ کس طرح سے اپنے کرداروں کو قارئین کی صف میں لاتا ہے۔ حقیقی معنوں میں اگر دیکھا جائے تو افسانہ نگار کے کردار ہی ہوتے ہیں جو مصنف کی شناخت کا سبب بنتے ہیں کرداروں سے ہی کسی بھی افسانہ نگار کے تجربات و مشاہدات اور ذہنی ارتقا اور افکار کا اندازہ ہو سکتا ہے کیوں کہ کردار راستے ہوتے ہیں مصنف کے خیالات کی گلیوں میں قدم رکھنے کے لیے مصنف کے افکار کی بازگشت ہوتی ہے اس کے خیالات میں یہ کردار ہی ہوتے ہیں جو ان گلیوں میں چھپے تصورات و خیالات محسوس کرتے ہیں یہ کردار ہی ہوتے ہیں جو افسانہ نگار کی سوچ کو کریدنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

کردار نگاری کی تعریف:

بول چال میں لفظ کردار کی پہچان انسان کی شخصیت یا اس کے فعل، رویے اور روش سے کی جاتی ہے جب کہ ادب کی دنیا میں اشخاص قصہ کو کردار کہتے ہیں اور ان کی فنی پیش کش کو کردار نگاری کہتے ہیں کسی بھی قصے کے اشخاص یا کردار عموماً انسان ہوتے ہیں جو سماج کے چلتے پھرتے زندہ انسانی کرداروں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں لیکن ان کی تشکیل میں فن کار کے تخیل، مشاہدے اور فن کاری کا بہت زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم کوئی افسانہ پڑھتے ہیں اور اس افسانے کے کردار ہم کو اپنے معاشرے کی گلیوں میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے وہ یہ ہے کہ مصنف کے مشاہدات و تجربات افسانے میں بول رہے ہوتے ہیں۔

اس طرح الفاظ کی شکل میں فن کار جو بھی کردار تراشتے یا تشکیل دیتا ہیں وہ سماج کے زندہ انسانوں یا حقیقی کرداروں کی طرح لگتے ہیں بعض لغات میں کردار کے معنی روش طرز، عمل، فعل، رفتار، چلن طور طریقے، عادت، خصلت، برتاؤ، شغل، کام دھندہ اور اخلاق کے ہیں۔

کردار اپنے عام معنوں سے قطع نظر ایک اصطلاح بھی ہے افسانوی ادب سے متعلق جتنی باتیں ہم نے مغرب سے اخذ کی ہیں ان میں ''کردار'' کی اصطلاح بھی ہے جو انگریزی لفظ کیریکٹر Character کا بدل ہے۔

ڈاکٹر انجم الہدیٰ کے مطابق:

> ''کرداری کی اصطلاح انگریزی لفظ کیریکٹر کا بدل ہے'' [۱]

اسی طرح سید صفی مرتضیٰ لکھتے ہیں:

> ''کردار ان انفرادی خصوصیات کا نام ہے جن کی وجہ سے ایک شخصیت دوسری شخصیت سے ممتاز ہوتی ہے'' [۲]

اردو افسانوی ادب میں بہت سے ایسے کردار موجود ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں ان کرداروں کو آج بھی ادبی دنیا میں بہت پزیرائی حاصل ہے اگر میں چند نامور کرداروں کی بات کروں تو ان میں انارکلی، امراؤ جان ادا،

اصغری اکبری، کیسو، مادھو، بدھیا، ایسے کردار ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں اسی طرح اور بھی بے شمار کردار ہیں اپنے اندر ایک پوری معاشرت اور تہذیب و ثقافت چھپائے ہوئے ہیں یہ کردار ایسے چند کردار ہیں اگر بندہ دل سے پڑھے تو بندہ اس زمانے کی تاریخ مرتب کر سکتا ہے اگر آج بھی کوئی امراؤ جان ادا ناول پڑھ لے تو وہ لکھنو کی معاشرت تہذیب و ثقافت کی کہانی لکھ سکتا ہے۔

کردار اپنے اندر اپنے سماج کی ہر چیز کو چھپائے ہوتے ہیں بس ایک اچھے اور محنتی قاری کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ میدان میں آجائے تو تاریخ کے خاموش گوشے بولنا شروع ہوجاتے ہیں۔

کردار نگاری کی اہمیت:

افسانوی ادب اول تا آخر بیانیہ ہوتا ہے یہ بیان مختلف اشیا کے ساتھ اعمال و افراد کا بھی ہوتا ہے اس بیان کو ہم قصہ، حکایت، داستان، ناول یا افسانہ کہتے ہیں ان سب میں افراد قصہ ہونا ضروری ہے انسان ہونے کے ناطے قاری کے دل و دماغ میں اپنے ہی جیسے دوسرے افراد کے اعمال و افعال کو سمجھنے اور جاننے کا بھی بڑا تجسس اور اشتیاق رہتا ہے فکشن میں افراد قصہ یا کردار انسانوں کے علاوہ کوئی حیوان یا مافوق الفطرت عناصر بھی ہو سکتے ہیں۔

کرداروں کو بہت اہمیت حاصل ہے کردار اگر پختہ اور جاندار ہوں تو کہانی قاری کو متاثر کرتی ہے اصل میں کردار ہی ہوتے ہیں جو کہانی کو پڑھوانے میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

افسانوی ادب کی مختلف اصناف میں جس طرح بعض خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اوصاف کی چند ضروریات بھی ہوتی ہیں ان میں سب سے پہلے قصہ پلاٹ، دوسری اہم چیز کردار ہوتے ہیں۔

جن پر قصہ اور پلاٹ کا انحصار ہوتا ہے داستان ہو یا ناول، افسانہ ہو یا ڈرامہ، قصے ہوں یا حکایات ان سبھی میں کرداروں کا ہونا بے حد لازمی ہے کیونکہ اس کے بغیر کہانی آگے سفر نہیں کر سکتی اور پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی لہذا جہاں بھی کوئی قصہ، کہانی ہوگی وہاں افراد کردار بھی ہوں گے اس طرح افسانوی ادب میں کردار ناگزیر ہیں کرداروں کی اہمیت کے بارے میں وقار عظیم لکھتے ہیں۔

> ''افسانوی فن کو تحریک میں لانے اور اسے پلاٹ کی مربوط منظم شکل دینے کے
> لیے کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے'' ۳؎

اس میں کوئی دورائے نہیں کردار ہی کسی کہانی کی جان ہوتے ہیں کہانی کو بڑا بنانے اور کامیاب بنانے میں کردار بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر کردار کمزور ہوں تو کہانی کامیاب نہیں ہوسکتی کیونکہ کہانی کی کامیابی و کامرانی اصل معنوں میں کرداوں میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

دراصل افسانوی ادب کی بنیاد، کیا ہوا؟ پر قائم ہے کیا واقعہ پیش آیا؟ کیسے ہوا؟ جن لوگوں کے ساتھ واقعہ پیش آیا وہ کون لوگ تھے؟ لوگوں سے مراد کردار سے ہے کرداروں کے بغیر کچھ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ افسانوی ادب میں پلاٹ کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کیونکہ کسی بھی فن کی بنیاد دنیا جہان کی کسی نہ کسی حقیقت پہ رکھی جاتی ہے۔ حقیقت کا تعلق انسانی زندگی سے ہے لہذا افسانوی متن کو بروئے کار لانے اور اس کو مربوط شکل میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کے لیے کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے داستانوں کے علاوہ ناول وافسانوں کے پلاٹ اس لیے دلچسپ و دلکش ہوتے ہیں کیوں کہ ان کا تعلق انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

بیانیہ کی حد تک کی داستان، ناول افسانہ یا قصے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لیے افسانوی اصناف سخن کو صحیح معنوں میں کامیاب وموثر بنانے اور واقعات کو بروئے کار لانے میں کردار نگاری ایک اہم ترین جز ثابت ہوتا ہے جہاں پہ کردار نگاری کی ضرورت ہوگی وہاں یہ افراد قصہ کا ہونا بہت لازمی ہے اسی لیے افسانوی ادب میں کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے اس بارے میں مجنوں گورکھپوری بہت ہی عمدہ بات لکھتے ہیں۔

> ''واقعات کسی نہ کسی سے متعلق ہوتے ہیں کیا واقعہ گزرا کے بعد سوال ہوتا ہے
> کہ کس کے ساتھ گزرا؟ افسانے کا دوسرا لازمی عنصر اس کے افراد میں خارجی
> واقعات سے بجائے خود کوئی قدر نہیں رکھتے بلکہ ان کی اہمیت کا دارومدار ان
> اشخاص پر ہوتا ہے جن سے وہ متعلق ہوتے ہیں۔'' ۴؎

داستاں اور ناول میں قصے سے قصہ جڑا ہوتا ہے اور بہت سے قصے ہوتے ہیں جن کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے مختلف کرداوں کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ داستان اور ناول میں کرداروں کی بھیڑ نظر

آتی ہے جب کہ افسانے میں اگر دیکھیں تو افسانے میں مختصر کہانی کی وجہ سے کردار بھی بہت کم ہوتے ہیں لیکن ایک بات بہت اہم ہے افسانے میں کرداروں کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو کہ ناول اور داستان میں ہوتی ہے لہذا افسانے کی تخلیق کے لیے کردار اسی طرح ضروری ہیں جس طرح ناول یا داستان کے لیے۔ اگر کرداروں پر مصنف کو گرفت ہوگی تو وہ فنکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال ہوگا کیونکہ کرداروں کو بہترین طریقے سے کہانی میں بیان کرنے کی بھی مصنف کی فن کارانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

وقار عظیم رقم طراز ہیں:

> ''افسانوں کے وجود کے لیے مواد کی فنی ترتیب اور پلاٹ کو جتنا ضروری اور اہم بتایا گیا ہے اس سے انکار نہیں لیکن اتنے ہی بلکہ بعض حیثیتوں سے اس سے بھی زیادہ ضروری خود افسانوی کردار ہیں۔''[۵]

افسانے کے اجزائے ترکیبی میں کردار نگاری کو زبردست اہمیت حاصل ہے افسانے کی کامیابی اور ناکامی بڑی حد تک اس جز پر قائم ہے۔

اگر یہ بات کی جائے تو بے جا نہیں ہوگا افسانے کی کامیابی اور ناکامی اسی پر موقوف ہے کرداروں کو بہت اہمیت حاصل ہے اگر کرداروں کو دیکھا جائے تو کسی بھی قصے کی جان ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر شکیل احمد لکھتے ہیں:

> ''افسانے کی تشکیل کے اہم عنصر کی حیثیت سے کردار نگاری کو زبردست اہمیت حاصل ہے افسانے کی کامیابی کا بہت کچھ انحصار کردار کی پیش کش پر موقوف ہے اسے بھی افسانے کی جان کہا جاتا ہے افسانے میں حرکت اور ماحول میں زندگی اسی کردار کی ذات سے وابستہ ہے۔''[۶]

افسانے میں افراد قصے کی حرکات وسکنات کو الفاظ کے جامہ میں پیش کرتے ہیں اچھے کردار کے لیے ضروری ہے کہ اس میں حرکت وعمل کے ساتھ انفرادیت بھی ہو قول وفعل اور اطوار وگفتار میں ہم آہنگی وتوازن بھی ہو کردار کو اس حد تک جاندار ہونا چاہیے کہ قاری کے ذہن میں نہ صرف اس کی تصویر اُتر آئے بلکہ ہنستا بولتا،

چلتا پھرتا دکھائی دے۔ لیکن مختصر ہونے کے سبب افسانے میں کردار نگاری مشکل فن ہے افسانے میں کردار کا ارتقا دکھانا ناول کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ عمل ہے۔ اس کے لیے فن کار میں مہارت و فنکاری دونوں کا ہونا لازمی ہے اگر ہم دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار کو مختلف زاویوں سے کردار پر روشنی ڈالنے کا موقع ملتا ہے جب کہ افسانہ نگار کردار کا کوئی ایک پہلو ہی کامیابی کے ساتھ پیش کرسکتا ہے اس لیے افسانہ نگار کو بڑی محنت و مشقت کر کے کردار کو تراشنا پڑتا ہے اردو افسانوی ادب میں کتنے ہی ایسے کردار ہیں جو زبان زد عام ہیں ایسے لگتا ہے کہ وہ کردار حقیقی کردار تھے وہ کبھی کسی کہانی کے کردار تھے ہی نہیں۔ مصنف کو بڑی سوچ سمجھ کر ساتھ کردار کو تراشنا پڑتا ہے تاکہ وہ قاری کے دل میں اپنی جگہ بنا سکے۔ اردو ادب میں بہت سے ایسے کردار ہیں جن کو پڑھ کر انسان کو اجنبیت بالکل بھی نہیں ہوتی ہے۔

بلکہ وہ طلسمی کردار ہیں ان میں کوئی خاص قسم کا سحر ہے جو قاری کو اپنے حصار میں لے لینے کی اہلیت رکھتا ہے آپ انارکلی کا کردار دیکھ سکتے ہیں اسی طرح امراؤ جان ادا کا کردار ہے، اگر افسانوں کی بات کریں تو افسانہ کفن کے کردار گیسو مادھو بدھیا جیسے کردار پچھلی دو سو سال تک افسانوی ادب میں نہیں ملتے اسی طرح بہت سے کردار ہیں جو بے مثالی ہیں جن کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بعض نئے افسانہ نگار کردار نگاری کو اہمیت نہیں دیتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ آج کے زمانے میں ایسا انسان کہاں جو ہیرو کی جگہ لے سکے اس کی ایک مثال غلام عباس کا افسانہ انندی بھی لیا جا سکتا ہے۔ جس کے اندر کوئی بھی ہیرو یا مرکزی کردار نہیں لیکن اردو دنیا میں وہ اپنی مثال آپ ہے اگر یہ بات کی جائے کہ اردو میں آنندی افسانے کی کوئی نظیر نہیں تو یہ بات ہرگز غلط نہیں ہوگی اگر بڑے افسانے میں دیکھا جائے تو آنندی کو پہلے دوسرے مقام پر جگہ ضرور مل جاتی ہے افسانے میں کردار کئی اقسام کے ہوتے ہیں انسان کے علاوہ کوئی جانور، شے یا کوئی غیر مرئی شے ہوسکتی ہے یہاں مہارت قابل ذکر ہے کہ ان میں کوئی کردار بھی جب بحیثیت کردار آئے تو اس کو افسانے میں انسانی کردار کی حیثیت حاصل ہوگی اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ’’کہانی کا بنیادی موضوع انسان کے سوا کوئی نہیں حتی کہ جب جانور، پودا یا زرہ

> کہانی کا موضوع بنتا ہے تو بھی انسان کی صورت ہی اس میں منتقل ہوتی ہے اور
> وہ بھی انسان ہی کی طرح جذبات اور اعمال سے گزرتا ہوا نظر تا ہے۔'' [۷]

افسانے میں کردار کے متعلق ہر دور میں رویہ بدلتا رہتا ہے افسانہ نگار کا مقصد افسانے میں کردار کو محض وسیلہ بنانا ہوتا ہے لیکن اس سے کردار نگاری پر ہرگز ضرب نہیں لگتی البتہ یہ بات درست ہے کہ افسانے کا فن اس بات کا متحمل نہیں ہوتا کہ کردار کا بتدریج ارتقاء اس میں پیش کیا جا سکے اور اس لیے افسانے کا کردار ہماری نگاہوں کا مرکز زیادہ دیر تک نہیں رہ پاتا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کردار کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی چیز ہوتی جو قاری کو ہتھیا لینے کی کوشش کرتی ہیں اس میں کہانی کا پلاٹ منظر فطرت، مکالمے، زبان، جملہ بندی، کردار وغیرہ ہم کردار سے منہ نہیں موڑ سکتے یہ بھی کہانی کے لیے بہت لازمی ہیں یہ قارئین کو اپنی طرف راغب کرنے میں اپنا بھر پور کردار ادا کرتے ہیں لیکن بعض اوقات کردار قاری کو متاثر نہیں بھی کرتے بعض اوقات افسانے کا کردار ہماری نظروں کے سامنے دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں:

> ''مختصر افسانے کے فن میں کردار نگاری کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔
> مختصر افسانے میں کردار تو محض چند لمحوں کے لیے منظر عام پر آتے ہیں۔ مختصر
> افسانے میں کردار نگاری مقصد نہیں ذریعہ ہے۔'' [۸]

مذکورہ تفصیلی جائزے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ افسانوی دنیا میں کردار نگاری کی بڑی اہمیت ہے مندرجہ ذیل باتوں سے بھی کردار نگاری کی ضرورت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔

- ☆ پلاٹ اور واقعات کو اپنی منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے کردار لازمی ہیں۔
- ☆ افسانے کی کامیابی بعض اوقات کرداروں پر منحصر ہوتی ہے۔
- ☆ کرداروں سے انسانی نفسیات کو جاننے کا پتہ چلتا ہے۔
- ☆ افسانہ نگار کے نقطہ نظر کی وضاحت کرداروں کے ذریعے ہی ممکن ہوتی ہے۔
- ☆ افسانہ نگاری کرداروں کی روح میں اتر کر حقیقت کا عرفان حاصل کرواتا ہے۔

☆ انسان کی شناخت اور اس کے ذہنی و سماجی کیفیات کو سمجھنے میں کرداروں کی پیش کش سے بہت حد تک معاونت حاصل ہوتی ہے۔

☆ فرد کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کردار سبق آموز ہوتے ہیں۔

☆ کسی معاشرے کی اصلاح کے لیے کرداروں کو نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ معاشرہ اپنی اصلاح کر سکے۔

☆ افسانہ نگار اپنے مقاصد کو پانے کے لیے کرداروں کا سہارا لیتا ہے۔

☆ کرداروں کے ذریعے انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔

☆ قاری کے ذہن تک اعلیٰ انسانی اوصاف کو پہنچانے کے لیے کردار بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

روبینہ فیصل کے افسانوی کردار:

جہاں تک روبینہ کے کرداروں کا تعلق ہے تو جب بھی افسانے ہم پڑھتے ہیں تو انداز ہوتا ہے کہ یہ افسانے ہمارے اردگرد میں بسنے والے کرداروں کی کہانیاں ہیں جو تنگ و تاریک گلیوں میں پھر رہے تھے ان کی اچانک ملاقات ایک عورت سے ہوگی جو لکھنے کو جانتی تھی اور اس نے صفحہ قرطاس پہ رقم کر دیا۔ جب قاری ان کرداروں سے ملتا ہے تو اس کو یہ کردار اپنے معاشرے کی فضا میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں قاری کو شبا تک نہیں ہوتا کہ یہ کردار کوئی اجنبی ہیں میں جب ان کہانیوں کو پڑھ رہا تھا تو یہ کردار مجھ کو اپنے ہی معاشرے کے کردار لگتے تھے محسوس تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ کردار پتہ نہیں کہاں سے روبینہ لائی ہیں یہ مجھ کو اپنے معاشرے کے کردار ہی لگتے ہیں۔

محمد حمید شاہد لکھتے ہیں:

> ''اپنے کرداروں کو روبینہ فیصل نے محض سیاسی سماجی زندگی کی تطہیر کے لیے کہانی کے اندر رواں نہیں کیا ان کی پوری شباہت اور قامت بھی بنائی ہے۔ یوں کہ یہ

> کردار ہماری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں اور بھلائے نہیں بھولتے۔''[۹]

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ان کرداروں میں وہ اہلیت ہے جو قاری کو مجبور کرتی ہے کہ وہ سوچے دیکھے کہ یہ کردار اس کے معاشرے میں ہیں یا نہیں اگر میں اپنی بات کروں تو میں نے یہ کردار اپنے معاشرے میں پائے مجھ کو زرا برابر بھی نہیں لگا کہ یہ کردار ہمارے معاشرے میں نہیں پتا نہیں مصنفہ نے یہ کردار کس دنیا سے کشید کیے ہیں۔ کسی بھی لکھنے والے کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ کرداروں کو جب لے تو حقیقی دنیا کی کوکھ سے کشید کرے تاکہ اس کے قارئین کسی ابہام میں مبتلا ہونے سے بچ سکیں۔ روبینہ فیصل نے جو بھی کردار دیے ہیں وہ ہمارے ہی معاشرے کے کردار ہیں اگر ہم اپنے معاشرے میں دیکھیں تو میں یہ بات یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ یہ کردار ہمارے اپنے معاشرے کی گلیوں میں بھاگتے دوڑتے ملیں گے کیونکہ حقیقی کردار کسی بھی معاشرے کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ اُن کے کردار معاشرے کے زندہ کردار ہیں جو انسان کے دکھوں، تکلیفوں، خوشیوں، غموں کی نمائندگی کرتے ہیں روبینہ کے کردار زندگی کے سارے رنگ دیکھتے ہیں زندگی کے نشیب وفراز کو دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

محمد فاروق عزمی لکھتے ہیں:

> ''روبینہ کے افسانوں کے کردار ہمارے ہی معاشرے کے زندہ اور جیتے جاگتے کردار ہیں جن میں زندگی سانس لیتی ہے، دکھ، دکھ کی طرح ہی محسوس ہوتے ہیں۔ تنہائیاں، اداسیاں اور رفاقتیں بولتی ہیں محبتیں اور نفرتیں زندگی کا دامن تھامے کبھی جینے کا حوصلہ بنتی ہیں اور کبھی موت کی تمنا کرتی نظر آتی ہیں روبینہ میں زندگی کو بہت باریک بینی سے دیکھنے، سمجھنے اور اپنی کہانی کے کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی جو صلاحیت اور طاقت موجود ہے اسے دیکھ کر یقین آتا ہے کہ وہ زندگی کو عام نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ محسوسات، احساسات اور جذبات کا کوئی خاص پیمانہ سامنے رکھ کر دیکھتی جانچتی اور پرکھتی ہے''[۱۰]

آپ کا ایک افسانہ ہے ''پاک سر زمین'' اس افسانے کے کردار ہمارے معاشرے کی عکاسی کی زندہ

مثال ہے اس افسانے کا اہم کردار ایک عورت ہے جس کا نام ''یاسمین'' ہے۔ جو خود فریبی کا لبادہ اوڑھ کر زندگی گزارتی ہے جو اپنے خاوند سے جھوٹ بولتی ہے اور اپنی جنسی تسکین کے لیے اپنے ہی گھر میں آنے والے اس مولوی کا انتخاب کر لیتی ہے۔ جس پر معاشرہ بہت اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے کیونکہ وہ قرآن مجید کی تدریس کا کام کرتا ہے اس افسانے میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ یاسمین نامی خاتون اپنے ہاتھ رنگتی پکڑی جاتی ہے تو وہ اپنی خود فریبی کو بچانے کے لیے مولوی صاحب کے ہاں میں ہاں ملا کر اپنے سسر کو موت کی آغوش میں دے دیتی ہے۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جو حقیقت کو جاننے کی کوشش تک نہیں کرتے سنی سنائی بات پر یقین کر کے اپنی طرف سے فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ اس افسانے میں مولوی صاحب جب رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں تو وہ اسلام کا سہارا لیتے ہیں اور اسی وقت اس کی موت کا فیصلہ جاری کر دیتے ہیں اس طرح لگتا ہے جیسے شاہی فرمان جاری ہوا جس پر عمل درآمد لازمی ہے مولوی نے یہ کام معاشرے میں اپنی ساخ کو برقرار رکھنے اور اپنی عزت کو بحال رکھنے کے لیے سب کچھ کرتا ہے اس کو اس بات کا اندازہ ہے کہ لوگ اس کی بات پر یقین کریں گے حالانکہ لوگوں کو سچائی کی تلاش کرنی چاہیے حقیقت کو جان کر تسلیم کرنا چاہیے لیکن بدقسمتی سے یہ بات کرنا پڑھ رہی ہے ہم لوگ اس معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں ماں باپ کی بات نہیں مانی جاتی لیکن ایک امام مسجد کی بات کو اس پر فوقیت دے دی جاتی ہے جو کسی بھی سماجی شعور رکھنے والے معاشرے کی اقدار کو بے معنی کر سکتی ہے۔ میں ایک اقتباس آپ کی نظر میں ضرور پیش کروں گا کہ کس طرح سے مولوی نے سادہ لو انسانوں کو ایک معصوم جان کو قتل کرنے پر منٹوں میں رضا مند کر لیا اور کس طرح سے اپنا مکروہ چہرہ چھپا لیا۔ مجھے ایسے لوگوں پر دکھ ہوتا ہے جو صداقت کے پچھلے اتنا نہیں بھاگتے جتنا وہ مولوی کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں۔

اقتباس دیکھیے:

> ''مومنو!! ہاتھوں سے نہیں، لاتوں سے نہیں، اس شیطان کو پتھروں سے مارو،
> بالکل اسی طرح جیسے حج کرتے ہوئے شیطان کو کنکریاں مارنے کا حکم ہے، سمجھو،
> گوجرانوالہ میں بیٹھے تمہارا حج ہو جائے گا یہ سنتے ہی ہجوم تو جیسے پاگل ہاتھی کی
> طرح بے قابو ہو گیا پتھر اینٹیں غرض جو ہاتھ لگا اس کے باپ کی طرف اچھالا

> جانے لگا یہاں تک کے اس کے ساتھ کھڑے ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے نے زمین پر پڑے ہوئے پھلوں کے سوکھے چھلکے مٹھی میں بھر کر اس کے باپ کی طرف یوں زور سے اچھالے جیسے ان ہی سوکھے چھلکوں سے کنکریوں جتنا ثواب لینا چاہ رہا ہو۔''[۱۱]

اگر ہم دیکھیں تو اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ کردار ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جو دوسرے کی نظروں میں نیک پارسا ہوتے ہیں لیکن اندر سے بہت ہی گرے ہوئے اور ظالم ہوتے ہیں بہت سے ایسے چراغ وقت سے پہلے اس لیے گل ہوگئے کیوں کہ ان کے پاس دلائل تھے ان لوگوں کے خلاف جو اپنے آپ کو عدل پسند، نیک مومن عبادت گزار کہلواتے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں ان لوگوں نے ایک پر سونا اور اوورکوٹ پہن رکھا ہے جس نے ان کے سارے عیب افشا ہونے سے بچا لیے ہیں لیکن ایک وقت ضرور آتا ہے جب یہ سارے عیب معاشرے کے سامنے آجاتے ہیں اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ آئے ہیں جو ساری زندگی اپنے ظاہری داغوں کو چھپانے کے لیے اپنی تمام عمر صرف کر دیتے ہیں اور وہ پھر بھی ان داغوں کو صاف نہیں کر سکتے جو ان کے دامن پر ایک بار لگ جاتے ہیں چاہے وہ اس جہاں میں چھپ چھپا کر زندگی گزار جائیں لیکن آخرت، آخرت ہے اس میں یہ چھپائے سارے داغ خود بول اٹھیں گے اس روز وہ تمام لوگ جو آج مولوی کی ایک آواز پر لبیک کہہ اٹھتے ہیں وہ وہاں کیا جواب دیں گے ایسے لوگ دنیا میں بھی بے نقاب ضرور ہوتے ہیں اور آخرت میں تو ہونا ہی ہے اس معاشرے میں کسی کو آئینہ دکھانا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کو وہ تمام عیب نظر آجائیں گے جو وہ نہیں دکھانا اور نہ ہی دیکھنا چاہتا ہے جیسے کہ اس افسانے میں مولوی اور یاسمین کا کردار ہے۔

جو ظاہری طور پر تو معاشرہ میں بڑے عہدہ پر فائز ہیں لیکن اندر سے وہ بہت ہی گھٹیا اور ظالم ہیں ہمیں اس طرح کے کرداروں کو پہچان جانے کی ضرورت اور قانون کے تابع لانے کی ضرورت ہے تا کہ یہ لوگ اپنی مرضی کے فیصلے نا سنا سکیں صرف اس لیے کہ ان کے چہرے لوگوں میں واضح ہو جائیں۔

اقتباس دیکھیے۔

> ''نہ جی۔۔ بس کریں مولوی صاحب۔۔۔ مولوی صاحب قانون زندہ ہے ابھی

> اور آپ کے سامنے وردی پہنے کھڑا ہے کفنانے کا انتظام کرو بیٹا جی۔۔۔ انسپکٹر
> نے ایک ہی سانس میں مولوی اور فیصل کو ہدایات دیں۔
> انسپکٹر صاحب کوئی کفن دفن نہیں، لٹکائیں گے شاخ پر الٹا اس کی لاش کو۔۔۔
> تا کہ آئندہ سے کوئی بھی جہنمی ایسی گستاخی کرنے کی جرات نہ کر سکے۔۔۔
> مولوی کے ساتھ کھڑے اس کے ایک چمچے کی آواز لگانے کی دیر تھی کہ ہجوم میں
> بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔
> لٹکائیں جی لٹکائیں۔۔۔ دفنانا کیوں؟ گدھوں کو نوچنے دیں۔'' ۱۲؎

روبینہ فیصل کے تمام کردار حقیقی کردار لگتے ہیں کیوں کہ جو بھی اُن نے کردار اپنے قاری سے ملانے کی کوشش کی ہے جو کسی دوسری دنیا کے اور اجنبی نہیں لگتے ہیں کیوں کہ جو بھی آپ نے کردار اپنے قارئین کو بتائے، ملائے ہیں ان کا تعلق اصل سے ہے یہ تمام کردار اجنبیت نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی ہوتی ہے۔ روبینہ نے معاشرے کو بہت باریک بینی سے دیکھنے کی سعی کی ہے۔ جس طرح سے انہوں نے کرداروں کے جذبات و احساسات کو سپردِ تحریر کیا وہ بے مثال ہے کسی بھی مصنف کے لیے داد یہ ہی ہے کہ قارئین اس کے کرداروں سے مل کر خوش ہو اور سراہیں۔ میں نے جب افسانے پڑھے ان کے کرداروں سے ملا تو میرا دل کرتا تھا کہ میں سمندر پار بیٹھی روبینہ کو پیام بھیجوں کے یہ تمام کردار میرے گھر کے سامنے رہتے ہیں انہوں نے ان کے بارے میں یہ باتیں کیسے کیں ہیں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی بھی لکھاری کو ماورا حقیقت جا کر بات نہیں کرنی چاہیے جو قاری کے لیے اجنبیت کا احساس پیدا کرے۔ روبینہ فیصل کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یقین مانیے ذرا برابر بھی بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا۔ آپ زندگی بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ معاشرے کے جسم سے لپٹے گلے سڑے سماجی رسم و رواج، خوف نا انصافی اور بے وفائیوں کے ناموروں کا آپریشن کرتے وقت ذرا برابر بھی رعایت نہیں برتیں۔ آپ نے مرد وزن کی تفریق کئے بغیر صنف نازک کو بھی اس بے رحم لیکن حقائق کی نظر سے دیکھا ہے۔

سید حسین حیدر لکھتے ہیں:

> ’’کردار ہو، پلاٹ ہو، کسی واقعے کا تجربہ یا تاثر ہو اس کو یہ ایک لڑی میں پرو کر جس منظّم طریقے سے نثر میں منتقل کرتی ہیں اس کی داد نہیں دی جا سکتی اس کے علاوہ جس خوبی سے یہ موجودہ دور کے نفسیاتی سماجی اور تمدنی مسائل کا تجزیہ کرتی ہیں اور اس میں جو سچائی اور حقیقت نگاری ہوتی ہے وہ ان کے افسانوں کے تاثر کو دوبالا کر دیتی ہے پھر بیانیے کا سادہ، فطری اور برجستہ لب ولہجہ قاری کی دلچسپی کو کسی مرحلے پر کم نہیں ہونے دیتا۔ اس کامیاب نثری تخلیق پر مصنفہ کو بہت بہت مبارکباد‘‘ ۱۳؎

انہوں نے جو کچھ اردو کے دامن میں اتارا ہے وہ سب حقیقی دنیا سے ہے اس میں کوئی مبالغہ آرائی سے کام نہیں اور نہ ہی اپنے قارئین کو نئے امتحان میں ڈالنے کی کوئی کوشش کی گئی ہے اسے داد دیتا ہوں۔ میرے خیال میں کسی بھی کہانی کار کو چاہیے کہ وہ کہانی لکھتے وقت اس بات کو یقینی بنائے کہ وہ جو کچھ بھی لکھے وہ حقیقت پر مبنی ہو اس میں کوئی غیر حقیقی چیز نہ ہو مثلاً اگر کوئی ایسی بات کر دی جائے جو حقیقت سے ماورا ہو اس کا اصل سے تعلق ہی نہ ہو وہ بس اس لیے ہو کہ افسانے کو پڑھتے وقت بس یہ لگے کیا نئی بات کی ہے قاری ایسی باتوں کو سنجیدہ نہیں لیتا بلکہ وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے وہ ایسی باتوں کو بے معنی سمجھتا ہے جو اس کو غیر حقیقی لگے قاری کے دل پر وہ باتیں اثر کرتی ہیں جو اصل ہو۔ روبینہ نے اپنے کرداروں کے ذریعے جو بھی باتیں کی ہیں وہ سب کی سب ہمارے معاشرے کی زندہ کردار ہیں وہ معاشرے میں متحرک نظر آتے ہیں قاری زیادہ حقیقت کو پسند کرتا ہے۔ خیالی دنیا میں اس کے لیے رہنا سانس لینا بہت مشکل ہے میں یہ بات کہہ سکتا ہوں روبینہ کے کردار معاشرے کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔

روبینہ فیصل کا ایک افسانہ ’’مغرور‘‘ ہے اس میں اگر کردار کی بات کی جائے تو ایک لڑکی ہے جو بیس سال بعد دوبارہ پیدا ہوتی ہے اور پھر اس جھیل کنارے پہنچ جاتی ہے جو محبت کی لاش سالم نگلنے کے بعد مردہ جھیل کے نام سے پکاری جانے لگی تھی بیس سال بعد جنم لینے والی مختلف کرداروں سے ملتی ہے جن میں ایک گوری کتا لیے واک کر رہی تھی بیس سال پہلے ایک لڑکی جو اب مکمل عورت بن چکی ہے کہانی اپنے تسلسل کے ساتھ رواں رہتی ہے اس

کہانی کا ایک کردار ہے نرمرغابی جو وفا شعاری اور محبت کی کہانی کو زندہ رکھے ہوئے زندگی گزار رہا ہے لڑکی جب اس سے ملتی ہے تو نرمرغابی آج بھی اپنی مادی مرغی کی موت کی جگہ پر مجاور بنا ہوا ہے لڑکی جب بیس سال بعد پیدا ہو کر اس کے پاس آتی ہے تو اس سے پوچھتی ہے کہ آپ آج بھی یہاں ہی تو نرمرغابی کچھ بیان کرتی ہے۔

اقتباس:

> ''وہ اپنی لمبی گردن کو تھوڑا اور لمبا کر کے کہتا ہے''اے لڑکی!! موسم جتنے بھی بدل جائیں میں یہیں مجاور بنا بیٹھا رہوں گا پیٹ کی خاطر ہجرت کی جا سکتی ہے، گرم موسم کی خاطر ہجرت کی جا سکتی ہے، مگر میری ضرورت تو محبت ہے جس کی خاطر میں کبھی بھی ہجرت نہیں کروں گا کیونکہ محبت بس ایک ہی جگہ سے ملتی ہے، ہر جگہ سے نہیں جو ہر جگہ سے مل جائے وہ دکانداری ہے محبت نہیں۔''[۱۴]

اگر روبینہ کے اس کردار کی بات کریں تو اس طرح کے کردار بہت کم ملتے ہیں لیکن اس طرح کے کردار انسان میں ایک انوکھا جوش ولولہ جنم دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کردار بہت گہرا اثر چھوڑتے ہیں اور اس طرح کے کرداروں کو قاری گہری نظر سے دیکھتا ہے کیوں کہ یہ اس کے لیے سبق آموز ہوتے ہیں قاری کے دل کو چھو کر گزرتے ہیں۔ اس افسانے میں بیس سال بعد لڑکی کا دوبارہ جنم لے کر اپنے معاشرے کا مشاہدہ کرنا حقیقی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا لیکن کسی مصنف کا بیس سال بعد کسی کردار کو پیدا کر لینا ممکن بھی ہے اور قابل داد بھی ہے اس میں روبینہ صاحبہ نے ایسے ہی کیا بیس سال بعد کردار کو جو معاشرے کی بھیڑ میں گم ہو گیا تھا اس کو تلاش کر لیا اور زیب قرطاس کر دیا۔ اصل میں مصنف کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اُن کرداروں کو تلاش کرے جو معاشرے میں دبے ہوئے ہیں جو نظر آ ہی نہیں رہے۔

روبینہ نے اُن کرداروں کی آوازوں کو ہی سنا ہے جن کی اس کو سننی چاہیئے تھی جو اس کے لیے لازمی تھی اُن کے تراشے ہوئے کردار زندگی کے بہت سے مسائل سے دوچار اور ان کا بہادری سے مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اُن کے کرداروں میں ایک خاص قسم کا جادو ہے جو اپنے قاری کو اس میں قید کر لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

فیصل عظیم رقم طراز ہیں:

> ''روبینہ کا مقصد اپنے گرد بکھری کہکشاؤں سے چمکتے زندہ ستاروں اور مردہ بے نور سیاروں، غرض ہر طرح کے ستاروں اور سیاروں کی آوازیں سننا اور ان کو پتھروں میں تحریر کرنا ہے'' [۱۵]

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ روبینہ نے اپنے اردگرد کی مجبور دکھوں سے چور آوازوں کو سنا ہے اور ان کو مسائل سے لڑنے کے لیے حوصلہ بہادری کی تعلیم دی ہے کسی بھی مصنف کا پہلا کام یہ ہی ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے مجبور انسان کی نمائندگی کرے تا کہ غریب لوگ آگے بڑھ سکیں۔

روبینہ فیصل کے افسانوی کردار حقیقی معنوں میں زندہ کردار ہیں جو معاشرے میں اصلاح کے فرائض نبھاتے ہیں جو لوگوں کو مضبوط اعصاب کے ساتھ مشکل حالات کا سامنا کرنے کی تلقین کرتے ہیں ان کرداروں میں وہ طاقت اور جرات ہوتی ہے جو انسان کو جینے کی امید اور مشکلات سے لڑنے کی اہمیت دیتی ہے۔

روبینہ فیصل کے افسانوی کردار اس قدر اصلی اور معاشرے میں رہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ شائبہ تک نہیں ہوتا کہ یہ کردار پتہ نہیں کہاں کے ہیں روبینہ نے ان کرداروں کو نہیں تلاش کیا بلکہ ایسے لگتا ہے کہ ان کرداروں نے آپ سے خود ملاقات کی ساری کہانی سارے دکھ سارے واقعات بڑی ترتیب کے ساتھ سنائے پھر جا کر روبینہ نے ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ صفحہ قرطاس پر زندہ رہنے، اور قارئین سے ملنے کے لیے ایک کہانی کی صورت میں ایک رابطہ بنا دیا اُن نے ایسے کردار دریافت کیے ہیں جو ہماری سماجی مجبوریوں، کمزوریوں اور اجتماعی بے حسی کو ہمارے سامنے لاتے ہیں میں یہاں پر اُن کے ایک افسانے کی بات کروں گا جس کا عنوان ''ایک ڈائری میں گم گھر کا سارا سامان'' یہ کہانی تین کرداروں کی صورت میں آگے بڑھتی ہے اس میں ایک بیوی سوہر ایک سہیلی ہے اس کہانی کا سب سے اہم اور ضروری کردار ماریہ نامی خاتون ہے جو تین بچوں کی ماں ہے اور ساتھ میں ایک نامراد بیماری کینسر کی مریضہ ہے اور دوسرا کردار سرفراز ہے جو بے وفائی اور بے حس، احساسات و جذبات سے محروم ہے اور اپنی عیاشی میں ڈوبا ہوا ہے اس کو کچھ پتا نہیں کہ میری بیوی کینسر کی مریضہ ہے اور دن رات کس مشکل سے گزر رہی ہے وہ ان تمام باتوں سے بے خبر ہے اس کہانی میں فلیش بیک

کی ٹیکنیک کا استعمال بھی کیا گیا ہے یہ کہانی سرفراز اور ماریہ کے ماضی کی ہے جب وہ ایک دوسرے کے لیے جان دیتے تھے اور محبت کے نغمات مل کر گاتے تھے۔ لیکن اب سرفراز کسی اور کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے اور ماریہ اپنی بیماری کینسر کے ساتھ دن رات بسر کر رہی ہے۔ اس کہانی کے جاندار کردار ماریہ ہے جو حیات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے چیزیں خریدتی رہتی ہے اس کا خیال ہے کہ مجھے برتن خریدنے چاہیے تاکہ اس گھر سے میری روح کے لیے جگہ نہ رہے ماریہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہیں جو بعد موت شمشہ نے نکالی اس میں آپ نے لکھا ہوا تھا۔

اقتباس:

> ''کیمو تھراپی جب اکیلے کروانے جاتی ہوں تو راستے میں ہی مرجانا چاہتی ہوں۔۔۔ لیکن دو دن بعد کھڑے ہو کر خوب سامان خریدتی ہوں۔۔۔ یہ سامان سے بھرا گم، میری خالی روح کو کبھی تو بھرے گا یا نہیں؟'' [16]

اس طرح کے بہت سے کردار ہیں جو سرفراز کی طرح ماریہ جیسی عورتوں کو محبت کے نوالے دے کر سمندر پار لے جا کر اپنی جنسی تسکین کے بعد بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں اگر ساتھ رہیں بھی تو برائے نام رہتے ہیں اصل میں کسی اور کے ساتھ شب و روز گزار رہے ہوتے ہیں جیسے شمسہ ماریہ کی سہیلی زندگی گزار رہی تھی۔

ہمارے معاشرے میں آج بھی بہت سے ایسے مرد ہیں جو عورتوں پر طرح طرح کے ستم کرتے ہیں مجھ کو سمجھ نہیں آتی ایسی عورت بہادری کا مظاہرہ کر کے ایسے شخص کو اپنی خوشحال اور مہکتی زندگی سے نکال کیوں نہیں دیتی۔ میرے خیال میں ایسی عورت خوف زدہ رہتی ہے کہ زندگی میں آگے کیا ہوا ہوگا اگر میں اس سے طلاق لے لوں تو پھر میرے ساتھ شادی کون کرے گا اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں سوچ کر اُسی رشتے سے جڑی رہتی ہیں۔ جس میں غم صرف اس کے لیے ہیں اور خوشیاں مرد کے لیے اس طرح کی عورتیں معاشرے کی باتوں سے ڈرتی ہیں کہ اگر اپنی زندگی سے جڑے دکھوں کو دفن کرنے کا سوچا تو یہ معاشرہ مجھ کو ہی دفن کر دے گا شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بے چاری عمر بھر مرتی رہتی ہے کبھی سکھ کا چین نہیں لے پاتی میں ایسی عورتوں کو ضرور مشورہ دوں گا کہ ماریہ کی طرح مت زندگی گزاریں اور نا ہی شمسہ کی طرح جو ایک ایسے رشتے میں رہے جس میں وہ بس وہ دم ساد

ھے زندگی گزارتی رہتی ہے۔

اقتباس:

> ''شمسہ اور اس کا شوہر ایک عجیب سے رشتے میں بندھے ہوئے تھے جس میں رہ کر انہوں نے ایک دوسرے کو چھوڑا تھا نہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ بس ندی کے دو کناروں کی طرح ساتھ ساتھ سینہ چوڑے کئے اپنی اپنی انا کی آگ دہکائے کھڑے تھے درمیان سے وقت کا پانی گزرتا جا رہا تھا اور وہ بس خاموش دم سادھے اسے گزرتے دیکھا کرتے تھے۔ ان کے درمیان سب گلے شکوے تک مر چکے تھے''[12]

کتنی ہی ایسی عورتیں ہوں گی جو ماریہ شمسہ کی طرح اپنے جذبات و احساسات سے معاہدہ کر کے زندگی گزار رہی ہوں گی اور کبھی اف تک نہیں کرتی ہوگی کتنی ایسی عورتیں ہوں گی جس نے عورت کی ذات کی لاج اور پردہ رکھا اور ظاہری دنیا میں اپنے خاوند کی تعریفیں کرتی رہیں اور دکھوں، تکلیفوں کو سہتی رہی۔ حالانکہ ان کے خاوند ظالم اور احساسات و جذبات کے مجرم تھے جن کو وہ ظاہری دنیا میں نیک دل بتاتی ہیں اور آئے روز اندر سے ٹوٹتی رہی پھر ایک دن ساری کی ساری ٹوٹ کر زمین پہ بکھر گئی اور لوگوں نے اکٹھا کر کے زمین تلے کر دیا۔ آج بھی بہت سے مرد سرفراز کی طرح ہیں جو محبت کے لقمے کھا کر نفرت کی دنیا میں سانس لیتے ہیں میں حیران ہوتا ہوں کہ محبت کے گیت الاپنے والا نفرت کے بیج کیسے بو سکتا ہے۔

روبینہ فیصل کے بیشتر کردار نسوانی کردار ہیں جو طرح طرح کے مصائب سے ہوتے ہوئے شب و روز کو گزار رہے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ روبینہ فیصل نے عورتوں کی نمائندگی کی ہے تو بے جا نہیں ہوگا کیوں کہ ''گمشدہ سائے'' میں کوئی ایک کہانی ایسی نہیں جو عورت کے مصائب کو بیان نہ کرتی ہوں مثال کے طور پر ''پاک سرزمین، ایک تھا شاعر ایک تھی اس کی بیوی، ایک ڈائری میں گم گھر کا سارا سامان، سگریٹ چور، مورتی کی کہانی، شیری کا انتقام، وارث ایسے افسانے ہیں جن میں روبینہ فیصل نے عورت پر ڈھائے جانے والے کرب اور ستم کے پہاڑوں کو شدت سے دیکھا اور بھرپور طریقے سے ان کرداروں کو زیب قرطاس کیا بلکہ میں تو یہ کہوں گا جس طرح

سے ان نے عورت کی نمائندگی کرنے کا سہرہ اپنے سر سجایا ہے وہ بے مثل ہے اُن نے معاشرے کے اندر جا کر دیکھا اور پھر ان سے حاصل مشاہدات کو ترتیب دیا۔

روبینہ نے تجربات اور مشاہدات کے خمیر سے اپنی کہانیاں اور ان کے کردار تراشے تا کہ معاشرے میں چھپے ہوئے مکرو اور گھٹیا چہروں کو عیاں کیا جا سکے بہت مشکل کام تھا۔ جو روبینہ نے سرانجام دیا۔

وہ اپنی کتاب ''خواب سے لپٹی کہانی'' میں رقم طراز ہیں:

> ''ہر انسان کے اندر کہانیاں دبی ہوتی ہیں، ہر کہانی پر ایک کتبہ لگا ہوتا ہے جس پر کردار کا نام کھدا ہوتا ہے ان کہانیوں کو ان کے کرداروں سمیت قبروں سے نکالنے کے لیے گورکن کی بہادری اور اہمت چاہیے اور کبھی ایک سے زائد کہانیاں اجتماعی قبر میں آپس میں چھپیاں ڈال کے ایسے بیٹھی ہوتی ہیں جیسے اون کا الجھا ہوا گولہ اس کی ڈوریوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے انہیں نام دینا کردار دینا اور سمت دینا، کانٹوں بھرا سفر ہے''۱۸؎

میں اُن کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں روبینہ نے جس طرح سے ان کرداروں کو معاشرے کی کوکھ سے کشیدہ اس کی مثال یہ افسانے خود ہیں ان کہانیوں میں آج کا معاشرہ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ کردار ہمارے ہی معاشرے کے کردار ہیں مجھ کو اس طرح کے کردار معاشرے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ میں روبینہ کے بتائے ہوئے اک اور کردار کی بات کروں گا اس افسانے کا نام ''سگریٹ چور'' ہے اس کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جو معاشرے کی نظر میں بے حیا، بد کردار اور طرح طرح کے القابات سے پکاری جاتی ہے لیکن حقیقت کوئی بھی نہیں جاننا چاہتا کہ ایسا کیوں ہے اس کو کیسے ٹھیک کیا جائے ہمارے لوگ حقائق کو دیکھنا اور سننا گوارا نہیں کرتے ان سے برداشت ہی نہیں ہوتا بلکہ میں تو یہ بات کروں گا کہ سچ ہضم ہی نہیں ہوتا۔ وہ عورت جس کو آج ہزار القابات سے نواز دیا گیا کوئی جاننا نہیں چاہتا کہ اس کی ذات اس کی حق دار ہے یا نہیں ایسے معاشرے کی اخلاقی قدریں بہت کمزور ہوتی ہیں جو سچ سے منہ موڑے سانس لیتا ہے وہ بے چاری سگریٹ چور کبھی ایک ایسی عورت تھی جس کو ان چیزوں کے بارے میں پتہ تک نہیں تھا لیکن وقت نے اس کو مشکل امتحان

سے گزار کر سگریٹ چور اور ہزاروں ایسے ناموں سے منسوب کر دیا جس کی اس کی ذات متحمل نہیں تھی کسی کو نہیں معلوم کہ وقت کی ٹہنی پہ وہ پھول تھی لیکن وقت کی خفگی اور ناراضگی نے اس کو ٹہنی سے جدا کر دیا اور وہ گرد و غبار کی زد میں لپٹی جانے لگی اس لڑکی کی زبان سے سنیے کہ کس طرح وہ سگریٹ چور بن گئی۔

اقتباس:

> ''جب پہلی دفعہ پکڑی گئی تھی تو خوب ڈری، اس بندے نے بھی مجھے خوب ڈرایا، جب میں اچھی طرح ڈر گئی تو اس نے مجھے، اپنے سینے کو انگلی سے ٹھونکتے ہوئے بولی۔۔۔ مجھے۔۔۔ سات سال کی بچی کو بے لباس کیا، اور پھر یوں لگا جیسے کسی نے میرے اندر آری چلا دی ہو۔ مگر اس سب کے بعد جب اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے پولیس کے حوالے نہیں کرے گا تو میں خوشی خوشی گھر آ گئی اور اس کے بعد جب بھی پکڑی گئی، یہی آری مجھ پر چلتی۔''[۱۹]

یہ کردار اپنے باپ کے لیے سگریٹ چوری کرتا کرتا سگریٹ کے بدلے فروخت ہو جاتا ہے یہ کردار ایک سگریٹ کے عوض سارے زندگی سگریٹ کے دھوئیں میں سانس لیتا ہے اس دھویں میں ہی اپنی زندگی کے خواب اڑتے دیکھتا ہے کتنا مشکل تھا اس کے لیے زندگی میں ایک سگریٹ باپ کے لیے لینے گئی تھی پھر ساری زندگی اس دھواں میں تھوڑی تھوڑی کرتے ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے اس طرح کی بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو مشکلات سہتی ہیں آئے دن ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں لیکن وہ اُف تک نہیں کرتیں اور نہ ہی شکوہ کرتی ہیں خاموشی کے ساتھ زندگی کاٹ دیتی ہیں لیکن کبھی کسی سے سکھ کی بھیک نہیں مانگتی ہیں ایک سگریٹ کے بدلے کس طرح سے ایک ننھی پھول فروخت ہو جاتی ہے اور پھر ہر روز فروخت ہوتی ہے۔

لڑکی کی کہانی اس کی زبانی سنیے۔

> ''جو سگریٹ باپ جلا کر اپنی بیٹیوں کو پکڑا جاتے ہیں وہ یونہی جلتے رہتے ہیں کبھی نہ بجھتے ہیں اور نہ ختم ہوتے ہیں، جانتی ہے اب یہی سگریٹ میری چھ سال کی بیٹی کے ہاتھ میں بھی ہے، کیونکہ اس کے باپ نے اسے سگریت کے بدلے

> مجھے میرے باپ سے لیا تھا۔ اب اس کی بیٹی کو کوئی اور اس سگریٹ کے بدلے
> لے جائے گا۔‘‘ [۲۰]

یہ کردار ایسا کردار ہے جس سے ہم اپنی جنسی ضرورت تو پوری کر لیتے ہیں لیکن اس کے عوض اس کو نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں دیتے نہ گھر نہ تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا، انسانیت پر یہ بہت بڑا سوال ہے کہ وہ کسی کے ساتھ ناروا سلوک کیسے کر سکتے ہیں ہمارے معاشرے میں بہت سے کردار ہیں جو انسانی بنیادی حقوق اور اخلاقی پستی کا شکار ہیں ان کو اپنی اخلاقی قدریں سنوارنے کے لئے کچھ کرنا چاہیے اور حکومتِ وقت کا فرض ہے کہ وہ ایسی عورتوں کو تحفظ دے جو معاشرے میں جنسی استحصال کا شکار ہیں جن کا کوئی نہیں وہ طرح طرح کے ستم برداشت کرتی ہیں اس وجہ سے کہ ان کا کوئی بھی نہیں اگر وہ کبھی اپنے اوپر ظلم و جبر کا حساب لینے کا سوچیں بھی بے بس ہو جاتی ہیں یہ کام حکومت کا ہے کہ ان عورتوں کے انسانی بنیادی حقوق کا تحفظ کرے۔ لیکن ایسا نہیں۔

سگریٹ چور ایک ایسی عورت ہے جو زندگی کے تلخ حالات سے لڑنے کے لیے مضبوط ہو جاتی ہے وہ خود تو اس طرح سے معاشرہ میں پھرتے ہوئے ظلموں کا سامنا نہیں کرتی لیکن دوسروں کو بہت کچھ سکھانے کے لیے کام کرتی ہیں تا کہ وہ اس طرح کے جبر سے بچ سکیں۔

اقتباس دیکھیے:

> ’’شیرنی بن شیرنی۔۔۔ ورنہ تیرا کالج تجھے کھا جائے گا کالج سے بچ گئی تو باہر کی
> دنیا تجھے کھا جائے گی۔‘‘ [۲۱]

ہماری نظروں میں ایسے کردار کسی کام کے نہیں ہوتے ہیں جنسی آسودگی کے لیکن اندر سے بہت گہرے ہوتے ہیں جتنے سمندر، ان سے بہادری سے معاشرے کے گھٹیا کرداروں کا سامنا کرنا سیکھا جا سکتا ہے جیسے کہ اس افسانے میں عورت کا کردار جو مائی کے نام سے پکاری جاتی ہے لیکن اس کے اندروں میں بہت سے مشاہدات تجربات دفن ہوتے ہیں ان کرداروں سے ہم جنسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اگر ان کے اندروں کو کریدیں تو بہت سے اسباق جنم لے اٹھیں گے۔ کیونکہ زندگی کی تلخیوں نے ان کو بہت سے سبق سنا دیئے ہوتے ہیں اس لیے میں روبینہ فیصل کے افسانوں کے کردار ہمارے ہی معاشرے کے زندہ اور جیتے جاگتے کردار ہیں جن میں زندگی

سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے دکھ، دکھ کی طرح محسوس ہوتے ہیں اور تنہائیاں، اداسیاں اور رفاقتیں بولتی ہیں محبتیں اور نفرتیں زندگی کا دامن تھامے کبھی جینے کا حوصلہ دیتے ہیں اور کبھی موت کی تمنا کرتی نظر آتی ہے روبینہ فیصل نے زندگی کو بہت باریک بینی سے دیکھنے سمجھنے اور اپنی کہانی کے کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی بھر پور اہلیت اور صلاحیت و طاقت ہے اسے دیکھ کر یقین آتا ہے کہ وہ زندگی کے روز شب کو عام نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ احساسات، محسوسات اور جذبات کا کوئی پیمانہ سامنے رکھ کر دیکھتی جانچتی پرکھتی ہیں یہی وجہ ہے ان کا قلم نشتر اور ہاتھ ایک ماہر جراح کا ہاتھ بن سا جاتا ہے اور وہ معاشرے کے جسم سے لپٹے گلے سڑے سماجی رسم و رواج، خوف ناانصافی اور بے وفائیوں کے ناسوروں کا آپریشن کرتے ہوئے ذرا برابر رعایت نہیں کرتی روبینہ مردوزن کی تفریق کے بغیر صنف نازک کو بھی اسی بے رحم لیکن سچی آنکھ سے دیکھتی ہیں جس طرح انہوں نے مرد کی کج ادائیوں اور بے وفائیوں کا پردہ چاک کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے مثال کے طور پر ’’پاک سرزمین‘‘ میں مولوی کے ساتھ یاسمین کو بے نقاب کیا ہے۔

وہ اپنی مثال آپ ہے آپ نے یاسمین جیسے مکروہ کردار کو ایکسپوز کرنے میں ذرا برابر بھی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوتی مجھے روبینہ فیصل کی ایک بات بہت پسند آئی کہ عورت لکھاری ہوتے ہوئے بھی ان نے اپنے افسانوں میں عورت کے دکھ درد اس کی مجبوریاں اور مسائل اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے آئینہ دکھانے کا فریضہ بھی بڑے احسن انداز سے سرانجام دیا ہے۔

روبینہ فیصل کے کردار نہ صرف ہمارے اردگرد موجود اور زندہ کردار ہیں بلکہ وہ اپنی زندگی میں کبھی تبدیل ہوتے، کبھی بگڑتے اور ٹوٹتے ، کبھی ہنستے اور کبھی روتے یہاں تک کہ زندگی کے تمام دکھ، تکلیفوں کو سہتے ہوئے اپنے آخری مراحل میں داخل ہوتے ہیں میں اُن کے افسانوں میں سے ایک کردار کی بات ضرور کروں گا وہ ہے شیری کا کردار جو زندگی میں بہت دکھ برداشت کرتی ہے لیکن آخر میں اس کی زندگی میں استحکام آجاتا ہے اس کہانی میں دیکھنے کو ملتا ہے کیسے ایک عام عورت اپنے بچپن سے ظلم و جبر برداشت کرتی ہے طرح طرح کے حالات کا مقابلہ کرتی ہے اور جب بالآخر قدرے سکون کی منزل پر پہنچ جاتی ہے تو سماج کے دھوکے دہی کے عمل میں خود کو

بھی شریک کر لیتی ہے اور اپنی دانست میں اس کو معاشرے سے اپنا انتقام سمجھتی ہے۔

افسانے سے ایک اقتباس دیکھیے :

> ’’آج میں اتنی مضبوط ہوگئی ہوں کہ ایک مرد کو دھوکہ دینے کی طاقت رکھتی ہوں
> میرا سفر رائیگاں نہیں گیا میری سفر نگز بھی رائیگاں نہیں گئیں۔‘‘[۲۲]

اگر میں یہ بات کروں تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ روبینہ کے افسانوں کے کردار معاشرہ کے زندہ کردار ہیں اگر ان کو دل لگا کر پڑھیں تو یہ قارئین کی انگلی کو تھام کر معاشرہ کی گلیوں میں لے جائیں گے جہاں یہ کردار حیات کے روز و شب خاموشی کے ساتھ بسر کر رہے ہوں گے۔

میں یہ افسانے پڑھتے ہوئے کئی بار ان کرداروں سے ملا میں نے ان کو اجنبی نہیں پایا بلکہ ایسے پایا جیسے ان کے ساتھ میری صدیوں کی رفاقت قربت ہے۔

روبینہ فیصل نے گمشدہ سائے افسانوی مجموعہ لکھ کر اردو دنیا میں ایک اہم اضافہ کیا ہے اُن نے اردو کے باغیچوں میں ایسے بیج بویے ہیں جو پھلتے پھولتے رہیں گے اور اصلاح کا فرض نبھاتے رہیں گے۔ اُن کی خدمات کو یاد رکھا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ نجم الہدیٰ، ڈاکٹر، کرداری اور کردار نگاری، پٹنہ بہار اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰، ص:۵

۲۔ ایضاً، ص:۸

۳۔ وقار عظم، ''فن افسانہ نگاری''، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۷، ص:۱۴۴

۴۔ مجنوں گورکھپوری، افسانہ اور اس کی غایت، گورکھپور، ایوان اشاعت، ۱۹۳۵، ص:۳۳

۵۔ وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۷، ص:۱۴۴

۶۔ شکیل احمد، ڈاکٹر، اردو افسانوی سماجی مسائل کی عکاسی، گورکھپور، آفسٹ پریس، ۱۹۸۴، ص:۳۵

۷۔ گوپی چند نارنگ، پروفیسر، (مرتبہ) ''اردو افسانہ روایت اور مسائل'' دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰، ص:۱۱۶

۸۔ زاہد وبی، ڈاکٹر، راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ، علی گڑھ، وانگمیہ بکس، ۲۰۱۴، ص:۱۲۵

۹۔ روبینہ فیصل، گمشدہ سائے، لاہور، قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ۲۰۱۹، ص:۱۵

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۷

۱۱۔ ایضاً، ص:۳۲

۱۲۔ ایضاً، ص:۳۷

۱۳۔ ایضاً، ص:۲۲

۱۴۔ ایضاً، ص:۲۷

۱۵۔ ایضاً، ص:۲۰

۱۶۔ ایضاً، ص:۹۰

۱۷۔ روبینہ فیصل، خواب سے لپٹی کہانیاں، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۱۶، ص:۸۲

۱۸- روبینہ فیصل، ''خواب سے لپٹی کہانیاں''، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۱۶، ص: ۹

۱۹- روبینہ فیصل، گمشدہ سائے، لاہور، قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ۲۰۱۹، ص: ۱۰۴—۱۰۳

۲۰- ایضاً، ص: ۱۲۲

۲۱- ایضاً، ص: ۹۷

۲۲- ایضاً، ص: ۱۶۴

☆☆☆

باب سوم:

روبینہ فیصل کے افسانوں میں سماجی شعور

روبینہ فیصل کے افسانوں میں سماجی شعور

سماجی شعور:

سماج کا شعور ہر ذی شعور کے لیے لازمی ہے سماجی شعور سے مراد سماج سے متعلق آ گاہی اور اس کی پہچان ہے سماج کے عمومی وخصوصی رواج، روایات، رویوں اقدار، عقائد اور ثقافت سے آ گاہی اور باخبر رہنا بھی سماجی شعور کے دائرے میں آئے گا۔ ابتدائی زمانے میں انسان نے جب کھیتی باڑی کا آغاز کیا تھا تو اس سے لوگوں کا میل جول بڑھا جنگلی جانوروں اور قدرتی آفات سے بچاؤ اور تحفظ حاصل کرنے کے لیے باہمی تعاون کے حصول کے لیے سماج کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ یوں لوگوں میں سماجی شعور نے جنم لیا۔ فرد اور سماج ایک دوسرے پر منحصر ہیں فرد سماج میں رہ کر فروغ اور زندگی کی تمام منازل طے کرتا ہے بنیادی طور پر سماج میں انفرادی یا اجتماعی سطح پر وہی عناصر ترقی یا خوشحالی کی ضمانت دیتے ہیں جو سماجی شعور سے بھرپور اور گوندے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی فرد سماج اور اس کے متعلقات سے بخوبی واقف ہے تو وہ اس سماج میں رہ کر ترقی وخوشحالی حاصل کر سکتا ہے۔ جو فرد سماجی شعور سے نا آشنا ہے وہ زندگی میں خوشحال نہیں رہ سکتا اگر یہ کہا جائے انسان کی زندگی کے مراحل اس کے بغیر طے نہیں ہو سکتے تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔

سماجی آ گاہی ایک طرف انسان کو اچھے یا برے کے بارے میں سماجی شعور سے متعارف کرواتی ہے تو دوسری طرف اس کی فکر کو بھی اُجاگر کرتی ہے اسے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ سماج میں مختلف مسائل سے بھی آ گاہ کرتی ہے اس سے ایک بات ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہی سماج کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں جن کا سماجی شعور بیدار اعلیٰ وارفع ہو۔

فنکار سماج کا ایک بیدار مغز اور باشعور فرد ہوتا ہے بڑا فنکار اپنے فن پارے کو تخلیق کرنے کے لیے جس ذہنی اور فکری نظم وضبط کا مطالعہ کرتا ہے یہ اس وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب فنکار ایک شائستہ اور سلجھے ہوئے آدمی

کی طرح زندگی اور سماج کے تمام مظاہر سے اپنا تعلق وابستہ کرے اور اپنے چشم تخیل کے دروازے ہر قسم کے انسانی تجربے اور سماجی شعور کے لیے کھولے۔ ایک بڑا فنکار اس وقت بن سکتا ہے جب وہ سماجی شعور سے بہرور ہو اس کے بغیر کوئی بھی لکھاری بڑا ادیب نہیں بن سکتا کوئی بھی قلم سے رشتہ رکھنے والا سماجی شعور کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ کسی بھی قلم کار سے اس کا سماجی شعور بول رہا ہے تو یہ بات سو فیصد حقائق پر مبنی ہوگی۔

ایک ادیب سماج کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کرتا اور اس کو باریک بینی سے دیکھنے کی سعی کرتا ہے سماجی شعور کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں ہوسکتا اگر یہ بات کی جائے تو زیادہ بہتر ہوگی اپنے سماج کے شعور سے ہی تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے، لیکن روح سماج کی ترجمانی ہے اگر یہ کہا جائے کہ حقیقی معنوں میں یہ روح ہی نمائندگی کے فرائض سرانجام دیتی ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔

سماج میں موجود ہر فرد کو بالخصوص لکھاریوں کو چاہیے کہ وہ سماجی شعور کی بیداری کو اپنا شعار اور اس کو بہتر کرنے کے لیے مثبت کردار ادا کرے تاکہ معاشرہ میں مسائل کا سدباب کیا جا سکے۔ ایک فرد کے سماجی شعور میں اس کے گھر کا ماحول، والدین کی تربیت تعلیمی اداروں اور اساتذہ کا اہم ترین کردار ہوتا ہے۔

اگر ہم موجودہ دور کی بات کریں تو موجودہ عہد میں اہم مسائل مثلاً دہشت گردی، مذہبی شدت پسندی تعلیم وصحت کے مسائل، خوراک اور رہائش کی سہولیات کا فقدان، امن و امان کی مخدوش صورت حال اور انصاف کی عدم موجودگی وغیرہ کے مستقل حل کے لیے شعور از حد ضروری ہے اور یہ بنیادی مسائل جو انسانی زندگی کے ساتھ گہرے جڑے ہوئے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ ان میں انسان کی زندگی ہے تو یہ بات درست رہے گی۔

ادب اور سماج کا تعلق:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادب خلاء میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ ادب کو تخلیق کرنے والا سماج کا ایک حساس اور زمہ دار فرد ہے جو سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور حالات واقعات اس کے تخلیقی ذہن کو ممیّز کرتے ہیں۔

ادب اور سماج کا آپس میں بہت گہرا رشتہ وتعلق ہے اور یہی تعلق ادب کو سنوارتا ہے اسی لیے ادب کو سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے اس لیے ادب کو سماج سے الگ دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ادب کی بنیاد کے لیے گہرے مشاہدات و تجربات کا ہونا اشد ضروری ہے ادب کی بنیاد رکھنے میں بہت سی چیزیں مددگار ثابت ہوتی ہیں، جیسے کہ سماجی حالات و سیاست مذہب اور تہذیب وغیرہ یہ سب مل کر ادب کی بنیاد رکھتی ہیں۔ ادب میں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ زندگی ادب کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق:

> ''ادب میرے خیال میں زندگی، تہذیب، کلچر کا عکاس، ترجمان اور نقاد ہوتا ہے
> میرے خیال میں ادب ایک سماجی عمل ہے'' [۱]

میری نظر میں اچھا ادب وہی ہوتا ہے جس میں سماجی زندگی کے مسائل کی بہترین انداز میں عکاسی کی گئی ہو نہ کے عکاسی و نمائندگی کی گئی ہو ان مشکلات کا حل بھی پیش کیا گیا ایک سماجی شعور سے آشنا مصنف کے لیے لازمی ہے کہ وہ جہاں زندگی کو درپیش مسائل کو دکھا رہا ہو وہاں پر ان سے لڑنے اور ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے حل بھی تجویز کرتا رہے جس طرح ان کو بیان کرنا فرض ہے اس طرح ان کا حل بھی فرض ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لیے سماج کے حالات کا جائزہ لینا ناگزیر ہے ایک ادیب کی زندگی سماج کے اردگرد گھومتی ہے اور گردوپیش حالات واقعات کا تجزیہ کرتی ہے اور ان مسائل سے لڑنے اور بچنے کے لیے صحت مند کردار ادا کرتی ہے اگر یہ مثال دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا میں یہ کہنا چاہوں گا ادیب لکھاری ایک ڈاکٹر ہے اور معاشرے میں موجود انسانوں کے دکھ درد تکلیفیں سب اس کے مریض ہیں اب ڈاکٹر کا کام ہے اپنے مریضوں کے لیے بہتر سے بہتر حال تجویز کرنا اور ان کو اس مصیبت سے نکالنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا اسی لیے کہا ہے لکھاری ایک صحت مند کردار ادا کرتا ہے۔

احتشام حسین رقم طراز ہیں:

> ''ادب اپنی بنیادی حیثیت میں انفرادی نہیں سماجی ہے جسے سماج کے بہت سے
> عمل افراد کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔۔ لیکن اپنی نوعیت میں سماجی ہوتے ہیں

> اس طرح ادب کا ایک پہلو اس کا سماجی مواد اور موضوع ہے'' [٢]

ادب ہماری زندگی کا ایک اہم ترین جزو ہے ادب میں آباد کاری کرتے کردار ہمارے ذاتی جاننے پہچاننے والے کردار ہوتے ہیں وہ کبھی بھی اجنبی نہیں ہوتے۔ ادب ہماری تہذیب وتمدن کا آئینہ ہوتا ہے جس طرح کے ہمارے حالات واقعات ہوں گے اس طرح کا ہی ادب ہوگا لکھاری بھی ایک سماجی فرد ہے وہ جس طرح کے اثرات قبول کرتا ہے اس طرح کا ادب تخلیق کرتا ہے لکھاری تو سماج کے نقاد ہوتے ہیں چاہے وہ کسی بھی صنف سخن میں اپنے اظہار کو راہ دے دیں۔ ان کا مدعا ایک ہی ہوتا ہے سماج کی ہو بہو تصویر کشی کرنا اور ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کرنا۔

ادب پر سماج کے اثرات عموماً تین طرح کے ہوتے ہیں اور یہ اثرات موضوع ہیت اور زبان پر ہوتے ہیں سماج کے اثرات ادب کے موضوع کو شدت سے متاثر کرتے ہیں سماجی واقعات ادب کے موضوعات بن کر ابھرتے ہیں اسی طرح سماجی عوامل ادب کی ہیت کو بھی متاثر کرتے گزرتے ہیں۔ مثلاً مختلف اصناف کے عروج و زوال یا کسی صنف میں ہیت کے نئے تجربات کی ایک وجہ سماج میں بدلتے حالات بھی ہوتے ہیں۔

ادب اور سماج کا آپس میں تعلق یک طرفہ ہرگز نہیں بلکہ یہ رشتہ دوطرفہ ہے دنیا میں جتنا بھی ادب تخلیق ہوا وہ سب کا سب سماج کی کوکھ سے جنم لے کر قارئین تک پہنچا ہے ادب اور سماج کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے یہ دونوں آگے بڑھتے وقت ایک دوسرا کا ہاتھ تھام کر چلتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں ہی لازم و ملزوم ہیں تو بھی کچھ غلط نہیں ہوگا۔ ادب کی پرورش سماج کی چار دیواری میں ہوتی ہے ان کا آپس میں تعلق یک طرفہ نہیں دوطرفہ ہے۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

> ''جہاں معاشرتی عوامل اور محرکات ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں وہاں معاشرہ بھی ادبی رجحانات اور ادب سے اثرات قبول کرتا ہے'' [٣]

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ادب اور سماج ایک سکے کے دو رخ ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اچھا ادب سماج کو تبدیل کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ اگر ہم پوری دنیا

میں دیکھ لیں تو یہ بات غلط نہیں ہوگی اچھے ادب نے بہت سے فرائض ادا کیے ہیں یہاں تک کہ ایک پر مغز ادب جو جامعیت اور معنویت سے بھر پور ہو وہ معاشرے میں تبدیلی لانے اس کو سدھارنے کا کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ادب زندگی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اگر سمجھیں تو اس میں جو اہلیت ہے وہ اپنی مثال آپ ادب انسانی زندگی کا عکاس اور نمائندہ ہوتا ہے۔

رابعہ الرباء لکھتی ہیں:

> ''ادب نہ صرف سماج کا عکاس ہوتا ہے بلکہ سماج کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے''[۲۴]

سماجی شعور:

سماجی شعور لسانی اعتبار سے دو الفاظ کا مجموعہ ہے ''سماج'' اور ''شعور'' لفظ سماج سنکرت زبان کے دو الفاظ سے مل کر بنا ہے ''سم'' اور ''آج'' سم کے معنی ''اکٹھا'' اور آج کے معنی ''رہنا'' کے ہیں مطلب ہوا سماج کے لغوی معنی ایک ساتھ رہنے کے ہیں انگریزی زبان میں سماج کے لیے (Society) کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بھی اس سے ملتے جلتے ہیں۔ یعنی ''اکٹھا ہونا''

شعور عربی زبان کے مادہ ش ع ر سے نکلا ہے جس کے معنی جاننا اور محسوس کرنے کے ہیں اردو دنیا میں لفظ شعور کے معنی 'سمجھ بوجھ' دانائی احساس، آگاہی وغیرہ کے ہیں یعنی سماجی شعور کے معنی سماجی حالات و مسائل سے آگاہی کے ہیں۔

سماجی شعور دراصل ان مسائل سے آگئی اور واقفیت کا نام ہے جو سماج میں رہنے والے لوگوں کی کثیر تعداد کو متاثر کرتے ہیں مثال کے طور پر غربت، بے سروسامانی، اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کی مدد بھی کرنا ہے سماجی شعور دراصل معاشرتی حالات و مسائل کی آگاہی اور حتی الوسیع ان کو سلجھانے کا نام ہے۔

سماجی طور سے باشعور ہونے کا مفہوم:

سماجی طور سے باشعور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر آن آپ کو یہ شعور رہے کہ آپ معاشرے کے ایک

رکن اور حصہ ہیں اس ناطے سے ہم کا یہ فرض بنتا ہے کہ آپ لوگوں کے احوال و کوائف اور ان کے مختلف درپیش مسائل سے آ گاہ و واقف ہوں، ساتھ ہی اس بات کو بھی تسلیم کرنا کہ آپ کی کمیونٹی کے دوسرے لوگ بھی اسی عزت وتکریم کے مستحق ہیں جس کی آپ ان سے توقع کے خواہاں ہیں سماجی طور سے باشعور انسان اس بات سے بھی آ گاہ ہے کہ اس کو صرف اپنے ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے جذبات و احساسات کا بھی خیال رکھنا ہے۔

سماجی شعور کی اہمیت:

ایک مہذب انسانی سماج میں سماجی شعور کی اہمیت اور اس کی افادیت مسلم ہے یہ سماجی شعور ہی ہے جو ایک سماج کے لوگوں کو زندہ دلی عطا کرتا ہے سماجی شعور دراصل اخلاقیات (Ethics) اورحسن اخلاق کا ہی نام ہے جس کو کبھی بھی سماجی شعور سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ سماجی شعور ایک طرح سے سماجی تبدیلی کا ضامن ہے انسانی سماج کے مسائل اس وقت تک حل نہیں ہوسکتے جب تک ان کے اندر سماج کا شعور بیدار نہ ہوجائے جس روز یہ شعور جاگ جائے گا اس دن تبدیلی کی طرف پہلا قدم شروع ہوجائے گا جو کامیابی کی منزل تک لے جائے گا۔ سماجی شعور اصل میں ایک سماجی ذمہ داری ہے جو کوئی پوری کرے گا وہ سماج میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ یہ ایک طرح کا فرض ہے جو ہر انسان کے لیے پورا کرنا بہت ضروری ہے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں اگر کوئی انسان ان مسائل سے بے بہرہ اور ناواقف ہے تو وہ ایک مثالی انسان ہونے کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے سماجی شعور رکھنے والا فرد سماج میں موجود ناانصافیوں کے خلاف علم بغاوت کرتا ہے زندہ دل افراد سماج میں کسی طرح کی ناانصافی کو قبول نہیں کرتے وہ اس کے خلاف حتی الوسیع بغاوت کرتے ہیں۔

سماجی شعور انسانی وقار کا ایک اہم حصہ ہے اس کرہ ارض پر انسان کا درجہ اشرف المخلوقات کا ہے اگر وہ اپنے سماج میں موجود برائی کی تمیز نہ کرے، صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کی اہلیت اور جرات نہ رکھتا ہو تو پھر انسانی اور حیوانی سماج میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔

انسانیت کا وقار مجروح ہوجائے گا لہذا سماجی شعور سے خود کو مزین کرنا انسانی وقار کا بنیادی حصہ ہے میرے خیال میں سماجی شعور معاشرتی آ گاہی تو ہے ہی خود آ گاہی اپنے فرائض سے واقفیت کا دوسرا نام بھی سماجی

شعور ہی ہے۔

روبینہ فیصل کے افسانوں میں سماجی شعور:

اگر روبینہ فیصل کے افسانوں میں سماجی شعور کی بات کی جائے تو میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے سماج کو بہت باریک بینی سے دیکھا کیونکہ اُن کے افسانوں میں سماج کی آگاہی واقفیت صاف نظر آتی ہے کہ وہ کس قدر گہرائی سے معاشرتی مسائل حالات وواقعات کو سمجھتی ہیں۔

اصغر ندیم سید روبینہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پاکستان کے سماجی و سیاسی فیبرک کا تجربہ کرنے کے بعد کنیڈا جیسے ترقی یافتہ سماج کا مشاہدہ کرنے کے بعد روبینہ فیصل کا تخلیقی مزاج ترتیب پاتا ہے۔ اس طرح کا عصری شعور نئے موضوعات کے ساتھ زندگی کو پرکھنے اور اس کی باطنی بصیرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے روبینہ فیصل نے ان دو مختلف جہانوں کی زندگی میں ایسے کردار اور مسائل دریافت کیے ہیں جو ہماری سماجی مجبوریوں، کمزوریوں اور اجتماعی بے حسی کو سامنے لاتے ہیں۔''[۵]

میرے خیال میں کوئی بھی مصنف اس وقت تک کچھ بھی نہیں لکھ سکتا جب تک وہ سماجی شعور نہ رکھتا ہوا دل میں جو چیز انسان کو کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ شعور ہے اگر سماجی شعور سے کوئی شخص محروم ہے تو وہ اصل معنوں میں انسانیت کے دائرے سے کٹا ہوا ہے۔ کیونکہ انسان کو زندگی کے روز و شب گزارنے کے لیے سماج کے ساتھ تعلق رکھنا بہت لازمی ہے اگر یہ شعور نہ ہو تو پھر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا ہے انسان ،انسان اس لیے کہ وہ شعور رکھتا ہے وہ اچھائی برائی کے اصول وضوابط کو سمجھتا ہے حیوان ،حیوان اس لیے ہیں وہ احساسات و جذبات کو سمجھنے سے قاصر ہیں اس کے نزدیک کوئی قانون نہیں اور نہ ہی اس کو کسی قانون کا پابند کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ اس کے تابع کبھی آسکتے ہیں لیکن انسان اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق ہے سب سے افضل اور اعلیٰ ہے انسان کو ہی یہ مقام ومرتبہ حاصل ہے اگر یہ کہا جائے انسان اور جانور میں بنیادی فرق شعور کا ہے تو یہ بات غلط نہیں ہوگی کیونکہ دونوں کو یہ ایک نقطہ ہی الگ الگ کرتا ہے انسان نے شعور کو استعمال کرکے اپنے لیے اصول و

ضوابط بنا لیے ہیں اور جانور اس طرح کرنے سے قاصر ہیں اور نہ ہی ان کی دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ روبینہ فیصل نے سماجی شعور کو بیدار کرنے کے لیے بہت کوششیں کی ہیں جو قابل داد ہیں میں تو کہتا ہوں مصنف کو چاہیے کہ وہ جو کچھ لکھے سماجی شعور کو بلند کرنے کے لیے لکھے اُن نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سماجی شعور بولتا نظر آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ کسی نے سماجی شعور کو پا کر کچھ لکھا ہے۔

عمر فاروق عزمی روبینہ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''روبینہ میں زندگی کو بہت باریک بینی سے دیکھنے سمجھنے اور اپنی کہانی کے کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی جو صلاحیت اور طاقت موجود ہے اسے دیکھ کر یقین آتا ہے کہ وہ زندگی کو عام نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ محسوسات، احساسات اور جذبات کا کوئی خاص پیمانہ سامنے رکھ کر دیکھتی جانچتی اور پرکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا قلم نشتر اور ہاتھ ایک ماہر جراح کا ہاتھ بن جاتا ہے جو معاشرے کے جسم سے لپٹے گلے سڑے سماجی رسم و رواج، خوف نا انصافی اور بے وفائیوں کے ناموروں کا آپریشن کرتے ہوئے کوئی اور رعایت نہیں برتتی وہ مرد وزن کی تفریق کئے بغیر صنف نازک کو بھی اسی بے رحم لیکن سچی آنکھ سے دیکھتی ہے''۔[۶]

روبینہ فیصل کی ان تمام کہانیوں نے سماج کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہے ان میں سماج میں واقع پذیر ہونے والے حالات واقعات سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان سانسوں میں سماج کا شعور وہ جس طرح سے معاشرے کو درپیش مسائل کو قاری کو بتاتی ہیں وہ اُن کے گہرے سماجی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے اُن کے سارے افسانوں میں انسانی زندگی کو بڑے احسن طریقے سے بیان کیا گیا ہے روبینہ نے زندگی کو کسی خاص نظر سے دیکھنے کی سعی کی ہے یہ بات اُن کے سماجی شعور کی طرف ہی اشارہ کرتی ہے۔

سماجی شعور میں دراصل لکھنے والا کا تجربہ مشاہدہ اور گہری وابستگی بولتی ہے مصنفہ کی کہانی کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور انسانوں کو درپیش مسائل یا انسانوں کے پیدا کردہ مسائل کسی طرح دوسروں کے لیے

تکلیف دہ اور دل آزاری کرتے ہیں روبینہ نے ان کی وضاحت بہت ہی خوبصورت طریقے سے کی ہے اُن کی کہانیوں کے کردار معاشرہ کے زندہ کردار ہیں افسانے پڑھ کر لگتا ہے کہ انہوں نے ان کرداروں کے تمام دکھ بڑی تفصیل سے سنے اور پھر ان کا حل پیش کیا کسی بھی مصنف کے لیے ضروری ہے کہ اس کے تجربات و مشاہدات بہت گہرے ہوں کیوں کہ اس کے قلم سے اس کے معاشرے کے مسائل چھن چھن کر آ رہے ہوتے ہیں مصنف کے قلم سے اس کا سماجی شعور بولتا ہے۔

جتنا اس کا سماجی شعور بلند ہوگا اتنا ہی وہ اچھا معاشرے کا نمائندہ ہوگا مصنف اپنے معاشرہ کا عکاس ہوتا ہے اس کے الفاظ اس کے معاشرہ کی نمائندگی کا کردار ادا کرتے ہیں۔

اب ہم روبینہ کی بات کریں تو انہوں نے بہت ہی احسن طریقے سے قاری کو سماج کو درپیش مسائل بتاتی ہیں وہ اُن کے گہرے سماجی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مثال کے طور پر وہ جس طرح سے اپنے افسانے ’’صلح نامہ‘‘ میں انا اور خود پرستی کے بت پاش پاش کرتی ہیں اس میں اُن کا سماجی شعور واضح نظر آتا ہے اس میں روبینہ نے انسانی حرمت کو دلآویز انداز میں دکھایا ہے۔

اقتباس دیکھیے:

> ’’تو آؤ!! ایک دوسرے کی پناہ میں آ کر خوشی خوشی یہ شکست مان لیں اور میدان میں رہ کر لڑنے یا میدان سے بھاگ جانے کے سب راستے بند کر دیں اور بس اناؤں، مجبوریوں، رسموں، زنجیروں اور ضرورتوں کے تمام ہتھیار پھینک دیں ایک دوسرے کی ذات میں اپنی اپنی ذاتوں کو سرنڈر کر لیں اور ’’میثاق محبت‘‘ کے نام سے کسی اساطیری داستان میں قسمت کے اس لکھے کو درج کروا کر ایک دوسرے کی ذات میں کچھ کہے سنے بغیر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پناہ گزین ہو جائیں اور آنے والی نسلیں اس محبت کو حیرت سے پڑھیں گی جس میں اس کی موت ہوگی تھی مگر اس کی حرمت کو بچا لیا گیا۔
>
> آؤ!! بغیر دستخط کے عمر بھر کا صلح نامہ کر لیں۔ اور خاموشی اوڑھ کر اس شعور میں

دفن ہوجائیں جو ہم نے ایک دوسرے سے بچھڑ کر اپنے گرد اُگا رکھا ہے''۔ے

انا اور خود پرستی آج بھی ہمارے معاشرے کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے دنیا میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو انا کی بھینٹ چڑھ گئے ان لوگوں نے بس اپنی انا کو بائی پاس نہیں ہونے دیا ہم کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ انسان زندگی میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے اس کی تھوڑی سی جگہ پورے انسان کو موت کی آغوش میں لے کر جا سکتی ہے مجھ کو اس سے نفرت ہے جو انسانی زندگی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے ہم کو ہر اس چیز کو ہمیشہ کے لیے چھور دینا چاہیے جو انسانی زندگی کے لیے منفی تاثر چھوڑے یا جس سے انسانی زندگی کو خطرات لاحق ہوں مندر بالا اقتباس میں روبینہ نے انسان کو بتایا ہے یہ انا خود پرستی انسان کی دشمن ہے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر کے آگے بڑھنے کا سوچو۔ اگر تم ان مسائل میں پھنسے رہے تو بہت پیچھے رہ جاؤ گے ابھی وقت ہے ان چیزوں سے منہ موڑنے کا جو انسانی رشتوں کے لیے صحت مند ہیں ثابت نہیں ہو سکتی یا انسان کی ذات اُن کی متحمل نہیں ہے۔

روبینہ نے اس افسانے میں جس پہلو کی بات کی وہ بہت ضروری اور معاشرے کی جڑوں میں بیٹھا ہوا ایک پہلو ہے جس نے لاکھوں زندگیوں کو بے جان کیا ہے اور سماج کو اس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ہوگا کیونکہ انسان اس کی ضرب کا مستحق نہیں ہے۔

روبینہ کے شعور کا پتہ مندرجہ بالا اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر گہرائیوں سے اپنے قاری کو سمجھنے کی التماس کرتی ہے اس سے ایک اندازہ یہ بھی ہوتا ہے کہ روبینہ واقع زندگی کو کسی اور رخ سے دیکھتی ہیں یہ افسانے پڑھ کر اپنے آپ کو کنیڈا کی گلیوں میں دیکھنے لگا میں نے دیکھا کہ وہاں کے مسائل جس طرح سے مصنفہ نے پیش کیے ہیں بالکل حقیقی ہیں اور پھر میں نے اپنے ملک میں دیکھا تو یہ سارے مسائل وہی تھے جو ہماری گلیوں میں بکھرے پڑے تھے تو پھر میں سمجھا کہ انسانی مسائل تو ایک جیسے ہوتے ہیں انسان تو ایک جیسے ہوتے ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں وہ تو ایک طرح کے ہی ہوتے ہیں بس فرق اتنا ہے کہ کچھ لوگ معاشرہ میں رہ کر سانس لیتے ہیں اور کچھ معاشرے سے کٹ کر کچھ انسانی ضمیر کی آواز کو سنتے ہیں اور کچھ نہیں، جو لوگ سنتے ہیں وہ

سماجی شعور سے آشنا ہوتے ہیں اور جو نہیں سنتے وہ اس دولت سے محروم۔۔۔

روبینہ نے جن انسانی مسائل کی نقاب کشائی کی ہے وہ انسانی زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے طرح طرح کے مسائل ہیں روبینہ نے ان کو زیب قرطاس کر کے سماجی شعور کا ثبوت دیا ہے انہوں انسانوں کے مسائل کو سنا ہے اور اُن کو حل کرنے کے لیے ہر ممکن کوششیں کی ہیں یہ درپیش مسئلے کسی اور زندگی کو ہی نااختتام کی طرف لے جائیں۔ روبینہ نے اپنے افسانوں میں حقیقی معنوں میں سماجی عکاسی کی ہے انہوں نے نے انسانیت کو درپیش بہت سے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے کے بڑے موضوعات میں عورت پر استحصال، ناانصافی، رشتوں کی کمزوری مادیت پرستی، انسانیت سے نفرت، بے حسی، انا پرستی دم توڑتی انسانی حرمت، مردوں کا عورتوں پر ظلم و جبر صنفی امتیاز قوت برداشت سے محرومی وغیرہ کے موضوعات ہیں ان کو روبینہ نے بہت ہی اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔ روبینہ نے جس موضوع کو چھوا اس کو انوکھا اور منفرد بنا دیا ان کے موضوعات میں تنوع ہے جو کسی بھی بڑے لکھاری کو دوسرے سے ممیّز کرتا ہے۔

روبینہ کے موضوعات کے بارے میں فیصل عظیم لکھتے ہیں:

> ’’معاشرے میں دیمک کی طرح بیٹھے مسائل ہوس لالچ، مرد اور عورت کے تعلقات کی پیچیدگیاں، ان کے جذباتی اور جسمانی احساسات ازدواجی المیے، موت بے وفائی وغیرہ یہ سب روبینہ کے موضوعات ہیں۔‘‘ [۸]

روبینہ نے انسانی زندگی کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جو کہ کسی بھی لکھاری کے لیے لازمی ہوتا ہے اگر کوئی لکھاری زندگی اور انسانی سماج کو کہیں زاویوں سے نہ دیکھیں تو وہ سماج کی نمائندگی اچھے طریقے سے نہیں کر سکتا ہے۔ جسے روبینہ نے اپنے سماج میں مردوں کو آئینہ دکھایا اسی طرح عورتوں کو بھی آئینہ دکھایا کہ وہ کس طرح انسانی حرمت کو داغ دار کرتی ہیں وہ کس طرح فرض شناسی سے باغی ہوجاتی ہیں مثال کے طور پر وہ اپنے ایک افسانے ’’پاک سرزمین‘‘ میں یاسمین کے کردار کو معاشرے سے متعارف‘‘ کرواتی ہیں جو جنسی خواہش کو ایک مولوی کے ساتھ وابستہ کرتی ہے جو اس کے بچوں کو قرآن پڑھانے گھر آتا ہے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنا مکروہ فریب والا چہرہ چھپانے کے لیے اپنے سسر کو موت کی چکی میں پسوا دیتی ہے دوسرا کردار

ہمارے نام نہاد طبقے یعنی مولوی حضرات کا ہے تو دین کا سہارا لے کر وہ کام کرتے ہیں جو انسانیت پر بہت بڑا دھبا ہیں میں تو یہ کہوں گا جو کام انسان کرنے سے ڈرتا ہے جن کو وہ غلط تصور یا اخلاقی قدروں کے خلاف مانتا ہے وہ سارے کام یہ طبقہ مذہب کا سہارا لے کر لیتا ہے ایسے کرداروں کو پہچاننے کی اشد ضرورت ان کی وجہ سے معاشرے کی بنیادوں کو بہت سے خطرات لاحق ہیں مذکورہ کہانی میں مولوی صاحب اپنے آپ کو بچانے کے لیے نیک دل، شریف انسان کو قتل کروا دیتا ہے اور اپنے آپ کو مذہب کی پناہ گاہ میں لے جا کر بری ہو جاتا ہے ایسے نام نہاد، حضرات انسانیت کے نام پر دھبہ ہیں جو اپنی اہلیت کو سماج میں بچاتے اور پردوں میں لانے کے لیے ایک نیک انسان کی جان تک کا خیال نہیں کرتے، ہم کو سماج میں ایسے کرداروں کو بے نقاب کرنے کی اشد ضرورت ہے ایسے نیچ کرداروں سے انسانیت کو مستقبل میں کہیں خطرات کا سامنا ہونا ہے لہذا جتنا جلدی ہم ان سے چھٹکارا پالیں اتنا ہی اچھا ہے کیونکہ کہ انسانی زندگی ایسے کرداروں کی متحمل نہیں ہے ہم کو سماج میں ایسے کرداروں کو بے نقاب کرنے کی بے حد ضرورت ہے ان کے چہرے سے وہ نقابیں ہٹانے کی کوشش کرنی چاہیے جنہوں نے ان کے مکروہ فریب چہروں کو معاشرے کی نظروں سے چھپا رکھا ہے۔

مولوی صاحب قرآن پاک کے چند صفحات کو نذر آتش کر کے لوگوں کو کہتا ہے کہ یہ اس بندے فضل کے ابانے کیا ہے لوگ بغیر سوچے بغیر تحقیق کیے اس حکم کو تسلیم کر کے اس بے چارے انسان پر ٹوٹ پڑتے ہیں مولوی کا فیصلہ کجھ یوں لگا جیسے کسی ملک کی سپریم کورٹ نے کی قیس میں اپیل کا فیصلہ جاری کیا ہے اب اس کی پیروی کے علاوہ اور کوئی دوسری راہ نہیں۔

مولوی کا فیصلہ زرا دیکھیے:

اقتباس:

> ’’مومنو!! ہاتھوں سے نہیں لاتوں سے نہیں، اس شیطان کو پتھروں سے مارو،
> بالکل اسی طرح جیسے حج کرتے ہوئے شیطان کو کنکریاں مارنے کا حکم ہے سمجھو،
> گوجرانوالہ میں بیٹھے تمہارا حج ہو جائے گا۔‘‘ [9]

جیسے ہی شور کم ہونے لگتا مولوی جی اس کو مزید بھڑکانے کی مسلسل کوشش کرتے اور کوئی بھی حقائق کی

طرف نہیں دیکھنا چاہ رہا تھا یہاں تک کہ اس کے بارے میں سوچ تک نہیں رہا تھا لوگوں کو اس کے خلاف کر رہا تھا صرف اپنے اندر کے ڈر کو ختم کرنے کے لیے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے کہ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا ہاں پھر اپنی جان کے بچاؤ کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔

اسی لیے وہ بار بار حکم ہی جاری کر رہا تھا۔

اقتباس دیکھیے:

> ''شاید اسے مزید ڈرانے کے لیے یا پھر ہجوم کو ٹھنڈا ہوتے دیکھ کر مولوی زور سے چلائے لٹکا دو اس ملعون کو درخت سے۔۔ الٹا۔۔۔ لٹکائیں جی لٹکائیں۔۔۔۔ دفنانا کیوں؟ گدھوں کو نوچنے دیں۔''[۱۰]

اگر ہم اصل دنیا میں دیکھیں تو اس طرح کے کردار آج بھی معاشرے میں موجود ہیں جو ہر روز اپنی اصلیت اور مکروہ چیزوں کو چھپانے کے لیے بے گناہ لوگوں کو موت کی آغوش میں دے دیتے ہیں یہ کہانی ہمارے سماج کی حقیقی کہانی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصنفہ کا کس قدر مشاہدہ گہرا ہے ظاہری بات ہے مصنفہ بھی اس سماج کا حصہ ہی ہے جس میں آئے روز اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں اس افسانے کی مدد سے مصنفہ عورت کو اس کا اصلی چہرہ دکھانا چاہتی ہے اور مذہب کے استعمال سے اپنے چہروں کو چھپانے والے مردوں کو سماج میں بے نقاب کرنا چاہتی ہیں۔

میرے خیال کے مطابق لکھاری کو چاہیے کہ وہ حقیقی دنیا کی نمائندگی کرے اس کی تحریروں میں معاشرے کی گونج ہو اور معاشرتی مسائل پیش کرتے ہوئے انصاف کرنا چاہیے اب اگر دیکھیں تو روبینہ نے مردوں کو بھی آئینہ دکھایا اور عورتوں کو بھی۔ لیکن انہوں نے نے عورتوں کے دکھوں کو بہت قریب اور شدت سے محسوس کیا شاید اس لیے کہ مصنفہ ایک عورت تھی اور مسائل کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں لیکن روبینہ آئینہ بھی ساتھ ہی رکھا ضرورت پڑھتے ہی دکھایا بھی اس کی مثال اُن کا افسانہ ''پاک سرزمین'' ہے۔

میں تو اس حق میں ہوں جب کوئی بھی لکھاری تجزیہ یعنی معاشرے کی نمائندگی کر رہا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اس وقت صنفی امتیاز کو بالائے طاق رکھ کر سوچے اور حل پیش کرے تا کہ معاشرے میں استحکام آئے روبینہ نے جو

لکھا وہ انسانیت کو مدنظر رکھ کر لکھا نہ کہ مرد عورت کو۔۔۔ جہاں پر اُن کو لگا عورت غلط ہے وہاں پر اس کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں۔

محمد فاروقی عزمی رقم طراز ہیں:

> ''روبینہ نے اپنے افسانوں میں عورت کے دکھ درد اس کی مجبوریاں اور مسائل اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اسے آئینہ دکھانے کا فریضہ بھی بخوبی سرانجام دیا ہے''[۱۱]

''پاک سرزمین'' افسانے کا کردار یاسمین اس کی زندہ مثال ہے جس کو ایکسپوز کرتے ہوئے روبینہ نے ذرا برابر بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

اگر افسانے ''ایک تھا شاعر ایک تھی اس کی بیوی'' کی بات کریں تو اس میں مصنفہ نے ایک دل پھینک شاعر کی بات کی جو ہر وقت جنسی تسکین کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ شاعر کی بیوی چالاک اور سمجھ دار ہوتی ہے وہ اس کو دلدل سے نکالنے کے لیے کنیڈا لے کر چلی جاتی ہے لیکن اس کے سر سے بھوت نہیں اُترتا وہ پھر بھی ایک لڑکی کو شاگرد رکھ لیتا ہے شاعری کی اصلاح کے لیے آخر کار وہ اپنی جنسی تسکین کی طرف پھر چلا جاتا ہے ایک دن جب اس کی بیوی گھر پر نہیں ہوتی تو وہ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانے لگتا ہے۔

اقتباس دیکھیے:

> ''ایک دن اس نے اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں جب لڑکی اسے ملنے آئی تھی اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا تم میرے لیے دیوی ہو۔۔۔ میں تمہارے درشن کرنا چاہتا ہوں آؤ میرے قریب آؤ۔۔۔''[۱۲]

اس افسانے میں اگر دیکھا جائے تو مرد کی جذباتی ناآسودگیاں بیان کی گئی ہیں اس میں بتایا گیا ہے کہ مرد کی شادی ہونے کے باوجود بھی جذباتی ناآسودگیاں ختم نہیں ہوتیں۔

اس افسانے کے بارے میں اصغر ندیم سید رقم طراز ہیں:

> ''شاعر کی بیوی ایسا افسانہ ہے جس میں ہمارے شاعروں کی حرکتیں، ناکامیاں

اور جذباتی ناآسودگیاں بہت باریکی سے بے نقاب ہوئی ہیں۔'' ۱۳؎

ہم اس افسانے کا اپنے معاشرہ سے موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو یہ کہانی، کہانی نہیں رہتی یہ حقیقت محسوس ہوگی۔ اگر ہم دیکھیں تو ہمارے معاشرے میں کتنی ایسی عورتیں ہیں جو اس طرح کے حالات سے دو چار ہیں جن کے خاوند اپنی بیوی کے جذبات و احساسات کو اس کے سامنے پامال کرتے ہیں اور دوسری عورتوں سے محوِ گفتگو رہتے ہیں یہاں پر مرد کی نفسیات کا سوال آتا ہے جو اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش تک نہیں کرتا بس اس کی زندگی میں جنسی آسودگی کا دور دورہ رہتا ہے انسان ان چیزوں میں ہی پھنس کر رہ گیا ہے یہ وہ چیزیں جو انسان کے لیے ضروری نہیں اور نہ ہی انسان اُن کے لیے ہے اب ہم دیکھتے ہیں آج بھی بہت سے ایسے مرد ہیں جو ہر کام کو چھوڑ کر اس کو ضروری بلکہ فرض سمجھتے ہیں روبینہ نے اس پہلو پر بات کر کے بتایا ہے کہ مسائل اور حالات، تمنائیں انسان کو وہاں لے کر چلی جاتی ہیں جہاں سے واپسی بعض اوقات ممکن بھی نہیں ہوتی، جیسے کہ شاعر کی۔۔۔ یہ وہ خواہشات ہیں جن سے ازدواجی زندگی تو برباد ہوتی ہی ہے ساتھ ساتھ بندہ بھی خراب ہوجاتا ہے فرد کو اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہوگا ورنہ گھریلو زندگی میں طرح طرح کے مسائل ہوں گے جس طرح شاعر کے ہاں غربت و افلاس نے ڈیرے لگا لیے ہیں لیکن اس کو بس اپنے صلے یعنی جنسی آسودگی کی ہے وہ ہر وقت اس بارے میں سوچتا رہتا ہے اب دیکھیے شاعر کی بیوی بیچاری اس لیے اس عورت کو برداشت کرتی تھی کیونکہ اس کی وجہ سے گھر چلتا تھا شاعر تو کوئی اور کام کرتا نہیں تھا اصلاح اور زنا اس کا پیشہ بن چکا تھا۔

میں تو کہتا ہوں جب عورت پر ظلم ہورہا ہو وہ اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرے وہ اپنے اوپر ہونے والے جبر اور بربریت کا سینہ تان کر جواب دے اپنی ذات کے دفاع کے لیے جو کچھ کر سکے کرے۔ اگر ظلم کو برداشت کرنا شروع کر دے گی تو مظلوم ہو کر رہ جائے گی پھر ساری زندگی پستی رہے گی جس طرح سے شاعر کی بیوی پستی ہے اور برداشت کرتی ہے بعض اوقات ایسی عورتیں گھر کو بچانے کے لیے اپنے جذبات کی قربانی دیتی ہیں کہ گھر چلتا رہے۔

افسانے سے اقتباس دیکھیے کس طرح شاعر کی بیوی برداشت کرتی ہے اور کیوں؟

> ''شاعر کی بیوی نے فون رکھتے ہوئے سوچا کم بخت کہیں کی اچھا بھلا اس کی وجہ سے گھر اور بیڈ میں امن اور لطف آ گیا تھا۔ احمق کس کی، کیا تھا اصلاح دینے والے نے اگر ہاتھ پکڑ لیا تو۔۔۔ شاعری بھی تو اس کی مشہور ہونی تھی۔ لیکن ہوتی ہیں ایسی بے وقوف عورتیں۔۔۔ میں بھی تو بہت سال پہلے کتنی بے وقوف تھی، دوسری عورتوں سے حسد کرنے والی۔۔۔۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ اسے مرد کے ساتھ رہنا ہے تو ایک دوسری عورت کا درمیان میں ہونا کتنا ضروری ہے وہ چاہے شاپنگ مال ہو یا پارک یا ریستوران یا بیڈ، ان جیسوں کے ساتھ زندگی کو پر لطف نہ ہی پرسکون رکھنا ہے۔۔۔ اب ہماری گھریلو زندگی کا کیا بنے گا؟''[۱۴]

ہمارے معاشرے میں بہت سی ایسی عورتیں ہیں جنہوں نے دوسری عورت کو خاوند کی زندگی میں اس لیے آنے دیا ہوا ہے کہ ان کا چولہ اور گھر چلتا رہے۔ ہمارے سماج کا یہ مسئلہ بہت بڑا ہے لیکن یہ چھوٹا اس لیے بعض اوقات ہو جاتا ہے کہ عورت اپنے عورت ہونے کا بھرم رکھتی ہے۔ یا حالات کا تقاضا ہوتا ہے یا پھر قسمت کا لکھا ہوا تلخ فیصلہ جس کو ماننے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا یہ مصنفہ کے سماجی شعور سے بہرور ہونے کی واضح دلیل ہے کہ وہ سماج کو کس قدر باریک بینی سے دیکھنی کی کوشش کرتی ہیں سماج کے اندر سے ہی اُن کی کہانیاں پیدا ہوتی ہیں روبینہ کا معاشرتی مشاہدہ بہت گہرا اور حیران کن ہے طرح طرح کے مسائل کو وہ دیکھتی ہیں اور قارئین کو بتاتی ہیں جو قارئین مسائل زندگی سے آگاہ نہیں ہیں وہ روبینہ کی کہانیوں کو پڑھ لیں اور دیکھ لیں انسانیت کو کتنے درپیش مسائل ہیں۔ اُن کے ہاں موضوعات کی رنگا رنگی ہے جو اُن کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی شاہد ہیں انہوں نے معاشرے میں رہتے انسانوں کی نمائندگی کی ہے جو مختلف الجھنوں کا شکار ہیں اُن کی کہانیاں سماج کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ اُن کے بارے میں اختر شمار رقم طراز ہیں:

> ''مجھے ان کی کہانیوں میں آج کا معاشرہ سانس لیتا نظر آتا ہے عمیق اور گہرے مشاہدے سے روبینہ فیصل اپنے کرداروں کی نفسیات اور خصائل بھی متشکل کرنے پر قادر دکھائی دیتی ہیں ان کہانیوں کے موضوع اگرچہ سامنے کے ہیں

> لیکن اپنے تاثر سے یہ کہانیاں لہو میں گھل جاتی ہیں۔ ان کہانیوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان میں اداسی اور حلال کی زیریں لہر نمایاںں محسوس کی جاسکتی ہے زندگی کی رنگ رنگی سے گندھی کہانیاں اکیسویں صدی کے انسان کے اکلاپے اور کرب کا واضح اظہار بھی ہے قاری یہ کہانیاں پڑھتے ہوئے قدرے مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے'' [۱۵]

روبینہ کی کہانیاں سماج کی پیش کردہ تصویریں ہیں جن کو روبینہ نے کتابی شکل دی ہے یہ تصویریں جامد نہیں ہیں بلکہ متحرک چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ قاری کی اُنگلی پکڑ کر دور دور تک سیر کرواتی ہیں۔ یہ تصویریں بول کر قاری سے گفتگو کرتی ہے اور اپنے اوپر گزرے تمام شب و روز کو بیان کرتی ہیں۔ روبینہ نے بہت ہی احسن طریقے سے سماج کی عکاسی اور نمائندگی کی ہے اگر اُن کے افسانے ''ایک ڈائری میں گم گھر کا سارا ماماں'' دیکھیں تو یہ کہانی عورت سے ناانصافی مرد کی بے وفائی، احساس محرومی اور انسانی ذہن کی پستی کمزوری کو واضح کرتی ہے۔ اس کہانی کے کردار معاشرے کے زندہ کردار ہیں جس طرح روبینہ نے بتایا کہ ایک عورت محبت کے لیے کس طرح وطن کو قربان کر کے دیارِ غیر میں جا سانس لیتی ہے لیکن عمر کے ڈھلتے ہی اپنے خاوند کے ظلم وستم برداشت کرتی ہے ماریہ اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جس نے بہت ظلم وستم کو سہا، کسی مرد کا کسی عورت پر جبر اور استحصال جائزہ نہیں ہونا چاہیے اس طرح کے مردوں کے لیے سخت سے سخت قانون بنانے چاہیے تا کہ معاشرے میں انسانی حقوق کی پامالی اور انکاری سے بچایا جا سکے۔ ایک تو عورت بچاری کے حقوق پامال ہوتے ہیں اور دوسری طرف اس کے جذبات کا قتل بھی ہوتا ہے کسی بھی انسان کے جذبات واحساسات کو مجروح کرنا قتل کے مترادف ہے جیسے کہ اس کہانی میں ماریہ کا خاوند سرفراز سے جس نے اس کو ان کی بیماری کی حالت میں بھی اکیلے اور تنہا چھوڑ دیا اور سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ وہ دیار، غیر میں اور اس کے علاوہ اس کا وہاں کوئی بھی نہیں۔ ہمارے سماج میں بہت سے ایسے گھٹیا کردار ہیں جو اپنے مفاد کے حاصل ہوجانے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نظر انداز کر دیتے ہیں اس طرح کے مکرو چہرے ہیں جو آج بھی اس طرح کے گھٹیا اور ناگوار عمل کرتے ہیں اور عورت کو بس جنسی تسکین کے لیے استعمال کرتے ہیں جیسے کہ اس کہانی میں ہوتا ہے۔

میں چندسطروں میں ماریہ کو بیان کرتا ہوں۔ یہ ایک ایسی خاتون ہے جو اپنے وطن کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں جا بستی ہے لیکن جیسے ہی وقت اس سے ناراض ہوتا ہے اور پھر جوانی بڑھاپے کی دہلیز پر جا رکتی ہے تو اس کی قدر و قیمت ختم ہوجاتی ہے آج بھی اگر آپ دیکھیں تو بہت سے مرد مل جائیں گے جو حسن و جمال کے ڈھلتے ہی دوسری طرف ڈھل جاتے ہیں ماریہ بیچاری سمندر پار اپنوں سے دور ماری ماری پھرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو آخری عمر میں اسپتالوں تک لے جانے والا کوئی نہیں ملتا۔

اقتباس دیکھیے:

”کیمو تھراپی جب اکیلے کروانے جاتی ہوں تو راستے میں ہی مرنا چاہتی ہوں۔“[۱۶]

اسی طرح ماریہ بیچاری پل پل مرتی رہتی ہے مصنفہ نے ماریہ کے جذبات کو بہت باریک اور قریب سے دیکھا ہے ایسے لگتا ہے کہ جیسے ماریہ نے مصنفہ کو یہ کہانی سامنے بٹھا کر سنائی تھی۔

ایک جملہ دیکھیں اس طرح لگ رہا ہے جیسے مصنفہ نے خودنہیں لکھا بلکہ کردار نے خود لکھا ہے۔

اقتباس:

”میں مرنا چاہتی ہوں۔۔۔ زندگی کتنی بے معنی ہے کتنی جھوٹی۔۔۔“[۱۷]

یہ کہانی سماج میں درپیش عورتوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے یہ ایک ماریہ کا کردار ہے لیکن اصل میں بہت سی ایسی عورتوں کی کہانی جو آج بھی اس سے دو چار ہیں اور ہر روز اس طرح کے عمل اور مرد کے گھٹیا پن کو دیکھتی ہیں اور خاموشی کے ساتھ ہوتے جبر کو برداشت کر لیتی ہیں میں چاہوں گا کہ اس کہانی کا دوسرا کردار جو سماج پر ایک دھبہ ہے اس کو بھی آپ کے سامنے رکھوں۔ اس میں مرد ہے سرفراز جو کہ انسانی جذبات کو پس پشت ڈال کر آگے بڑھتا جا رہا ہے حالانکہ اصل میں وہ دلدل میں پھنستا جا رہا ہے لیکن وہ یہ بات تسلیم کرنے سے عاری ہے ماریہ وہ کردار ہے جو دکھ سہتی رہتی ہے لیکن گھر کی چار دیواری کونہیں چھوڑتی ہے اس کردار کا ایک بڑا پن یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر چلنے والے تمام تیر برداشت کرتی ہے یہاں تک بہتا لہو بھی خود ہی صاف کرتی ہے اپنے زخموں کو مندمل ہونے کے خود ہی سبق پڑھاتی ہے تمام تکلیفوں کو برداشت کرتی ہے لیکن کسی کو بتاتی نہیں ہے

وہ اپنے اوپر بیتے تمام حالات واقعات کو ایک ڈائری میں لکھ دیتی ہے اور دیار غیر میں موت اس کو فتح کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔

ہم کو اپنے معاشرے میں دیکھنے کی ضروری ہے کتنی ایسی عورتیں ہیں جو ماریہ کی طرح زندگی بسر کر رہی ہیں جن کے خاوندان کی ذات پر اثر انداز ہونے والے تلخ واقعات سے بے خبر ہیں ذاتی طور پہ یہ بات کر سکتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو حقائق کے برعکس ہو میرا تعلق بھی ایک پسماندہ علاقے سے ہے جہاں آج بھی بہت سے ایسے مرد ہیں جو عورتوں کی عزت اور خیال اس وقت تک رکھتے ہیں جب تک وہ خوبصورت جوان ہوتی ہے جیسے ہی اس کی جوانی وقت کی لہر میں بہہ کر سمندر میں شامل ہوجاتی ہے وہ آگے بڑھ جاتے ہیں اور کسی عورت کی تلاش میں مگن ہوجاتے ہیں اسی وجہ سے ہمارے معاشرے کی اخلاقی قدریں بہت کمزور ہیں کیونکہ یہ اپنی اخلاقیات کو بہتر بنانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں اور نہ ہی کرنا چاہتے ہیں۔ جب مرد دوسری عورت کی تلاش کر دیتا ہے تو وہ اپنی بیوی سے لاتعلق ہوجاتا ہے۔ پھر میاں بیوی کے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل ہوجاتی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناآشنا ہوجاتے ہیں پھر ان میں زمانے صدیاں حائل ہوجاتی ہیں۔

مجھے آج تک ایک سمجھ نہیں آئی کہ ایک عورت دوسری عورت کا حق کیوں مارتی ہے؟ کیوں اس کی زندگی میں خوشی کے لمحات چھین لیتی ہے؟ اور کیوں اس کو دکھوں کی وادیوں میں تنہا کروا دیتی ہے یہ عورتیں یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ کل کو تیسری عورت آئے گئی وہ مجھے بھی ایسے ہی ہی نکال دے گی جس طرح سے میں نے اس پہلی کو نکالا تھا جس نے اس مرد کی زندگی میں پہلا قدم رکھا تھا مجھ کو لگتا ہے جس طرح سے ماریہ کا حق ایک عورت نے مارا تھا اس کا بھی حق کسی دن ایک عورت نے مار لینا ہے۔

اس کہانی میں روبینہ نے بہت ہی بڑے اور سبق آموز پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے مزکورہ مسئلہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا مسئلہ ہے اس کو سلجھانے کی اشد ضرورت ہے روبینہ عورتوں کو مردوں کے جھانسوں سے محتاط رہنے کی تلقین کرتی ہیں تاکہ باقی عورتیں اس سے عبرت پکڑیں ورنہ ایسا نہ ہو بعد میں ماریہ کی طرح پشیمانی کا

سامنا کرنا پڑے اور اس پشیمانی کو دور کرتے کرتے موت کی آغوش میں نہ جانا پڑ جائے۔ جیسے کہ ماریہ کو آخر میں احساس ہو جاتا ہے۔

اقتباس:

> ''اس دھوکے باز اور ناپائیدار شخص کے ساتھ کینیڈا آنا میری بہت بڑی غلطی تھی، اس کے ساتھ شادی سے بھی بڑی اس پر اعتماد کرنے سے بھی زیادہ بڑی اب مجھے لوٹ کر اپنی مٹی اور اپنے گھر ہی چلے جانا چاہیے۔ اپنے ماں باپ کے پاس۔۔۔۔'' [۱۸]

مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ ماریہ ایک دو نمبر مکرو چہرے کو سماج میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واشگاف کر گئی اگرچہ یہ سارے واقعات لکھتے لکھتے اس کو اپنی جان کی بازی ہارنا پڑی۔

روبینہ نے سماج کے مسائل کو پیش کرنے میں انصاف برتا ہے یہ کردار حقیقی کردار ہے جو سماج کے مسائل کو بڑے احسن طریقے سے بیان کرتا ہے اگر ہم مجموعی طور پر اس کے بارے میں اپنی رائے دیں تو اس میں عورتوں کے حقوق کی پامالی کو بیان کیا گیا ہے اور اُن ستم کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جو معاشرے میں عورتوں کو درپیش ہیں یا جن سے ان کو ہر روز گزرنا پڑتا ہے مصنفہ نے عورت کی سسکیوں کی گونج سنی ہے اور کہانی کی صورت دی تاکہ دوسری عورتیں ان مسائل سے بچ سکیں جو پہلے دیکھے جا چکے ہیں۔

روبینہ کے بیشتر افسانوں میں عورت کی کہانی تحریر کی گئی۔ عورتوں سے جڑے مسائل کی بات، مردوں کے معاشرے میں ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور کیسے وہ اس دغلی، دورخی اور مطلبی دنیا میں زندگی گزار رہی ہیں ان افسانوں میں عورت بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی ذات کو اس قدر غم دکھ چاٹ رہے ہیں جیسے لکڑی کو دیمک، اسی طرح روبینہ کا افسانہ ''سگریٹ چور'' ہے اس کہانی میں مصنفہ نے پھر عورت ذات پر ہوتے ستم اور تشدد جیسی استحصال، وقت کی بے رخی سماجی شعور، اخلاقی شعور سے محروم انسان کو دکھایا ہے۔ جو عورت پر ستم کرتے ہیں اپنی جنسی تسکین کے لیے، جیسے اس افسانے میں مائی نامی خاتون ہے جس کے ساتھ ہر بندہ جسمانی تعلق قائم کرنے کے لیے رضا مند ہے لیکن اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنانے کے لیے کوئی رضا مند نہیں ہے اس

سے مجھے غلام کا افسانہ آنندی یاد آ گیا۔ جس میں طوائفوں کو شہر سے باہر اس لیے بھیج دیا جاتا ہے کہ ان سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ بے حیائی کو فروغ دے رہی ہیں یہ سماج کے لیے ناموضوع ہیں ان کے ہونے سے خطرہ ہے کہ بے حیائی ہی نہ پھیل جائے بالآخر فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ان کو شہر سے باہر جگہ دی جاتی ہے کہ وہ وہاں رہ سکتی ہیں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ وہاں بھیجنے والے خود وہاں آباد ہو جاتے ہیں۔ وہاں جاتے مختلف کام شروع کر دیتے ہیں بنیادی سوال یہ ہے کہ ان کو اپنی ذہنیت کو ٹھیک کرنا چاہیے تھا ان عورتوں کو شہر بدر کرنا ایک اخلاقی عمل ہیں بلکہ ان کو شہر میں رکھ کر ان کے جذبات و احساسات کی زبان سے کچھ سننا چاہیے تھا۔ سگریٹ چور مائی کو سمجھنے کی ضرورت تھی لیکن ہمارا معاشرہ ایسا کیا کرنے کی سعی کرتا ہے روبینہ نے اپنے سماج میں سے اپنے افسانوی کرداروں کو لیا ہے اور بعض دفعہ تو ایسے لگتا ہے کہ یہ کردار حقیقی کردار ہیں۔

روبینہ اپنی کتاب ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' کے دیباچہ میں لکھتی ہیں:

> ''میں نے پاکستان اور کنیڈا میں بکھری اپنے ہی لوگوں کی کہانیاں اکٹھی کیں جو کہ نہ کسی طرح میرے سامنے آ کھڑے ہوئی تھیں اور مجھے اتنا تنگ کرتیں کہ میں راتوں کو سو نہیں پاتی تھیں۔''[۱۹]

اس رائے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ روبینہ کہانیوں کو لکھتے وقت کن کن مسائل سے گزری مجھے لگتا کہ انہوں نے خود ان کرداروں کی زبان سے حالات واقعات سنے جو ان کو درپیش تھے اور پھر ان کو کہانی کی صورت دی۔ افسانوی کردار حقیقی کرداروں کے نزدیک یا حقیقی ہوتے ہیں روبینہ کے افسانوں کے کردار اصل اور معاشرے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

روبینہ فیصل خود رقم طراز ہیں:

> ''یہ موضوع نئے نہیں ہیں لیکن حالات اور کردار نئے ہونے کی وجہ سے مجھے ہر کہانی نئی لگی۔ میں ڈر کر یا دب کر یا ڈپلومیسی میں نہیں لکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے حساس اور بولڈ موضوعات کو بھی چنا ہے، میں ایسی باتوں کے مقام پر جا کر بھی دیکھا ہے جہاں جانے سے عام انسانوں کے پر جلتے ہیں۔''[۲۰]

روبینہ نے عورت کے ساتھ ہونے والے ستم کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے ان کے سارے افسانے جو گمشدہ سائے میں ہیں عورت کے مسائل کو ہی بیان کرتے ہیں اُن کا افسانہ ’’مینکس ‘‘ ایک افسانہ ہے جس میں ایک لڑکی اپنی کہانی فرش پہ بکھری کہانی، مسافر کہانی کو سناتی ہے اس کہانی میں لڑکی اپنے ساتھ ہوئے دھوکے فریب کا احوال سناتی ہے جس کو اس کا خاوند چھوڑ گیا تھا پہلے پہل تو اس سے محبت کرتا تھا لیکن ایک دن میں اس کو تنہا اور اندھیر نگری میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے اب اگر ہم آج کے معاشرے میں دیکھ لیں تو اس طرح کے مسائل ختم ہی نہیں ہوتے آئے روز کوئی نہ کوئی کیس سننے کو ملتا ہے آج بھی بہت سے ایسے چہرے ہیں جو عورت ذات کو فریب دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ مجھے آج تک ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ عورت اتنی جلدی بندے کے اندھیروں سے بھرے کمرے میں روشنی کی امید لے کر کیسے آ جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس کو کمرے کے اندر جھانکنا چاہیے کہ اس کے اندر کس قدر اندھیرا اپنی بزم سجائے بیٹھا ہے۔ ظاہر میں نظر آنے والے چند لوگ اندر سے بہت کھوکھلے اور دھوکے باز، منافق ہوتے ہیں عورت کو ایک مرد کی بانہوں میں اپنے آپ کو اتنی جلدی کیوں سونپ دیتی ہے اس کو اس کے اصلی چہرے سے نقاب ہٹانا چاہیے تاکہ وہ ہمیشہ کی شرمندگی سے بچ سکے، بعد کی ندامت زندگی بھر انسان کو کمزور کرتی رہتی ہے اس لیے میں کہوں گا کہ کسی بھی عورت کو اپنے جسم کی حوالگی کے وقت (یعنی شادی کے وقت) ہزار بار سوچ لینا چاہیے کہ اس کی یہ چند لمحات کی سپردگی عمر بھر کے لیے عذاب پشیمانی کا سبب تو نہیں ٹھہرے گی جیسا کہ اس افسانے ’’فنکس‘‘ میں لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے اس عورت کی زبانی ذرا کہانی سنیے۔

اقتباس:

> ’’سوچو جس کے بچے کی میں ماں بن رہی تھی وہ انسان مجھے کچھ کہے بغیر ہفتہ بھر کے لیے غائب ہو گیا میں فون کرتی تو کہتا مصروف ہوں بعد میں بات کرتا ہوں ویڈیو کال کرنے کی کوشش کرتی تو جو دور جا کر مجھ سے چوبیس گھنٹے ویڈیو ٹاک کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس بے وفائی کے ہفتے میں مجھے کبھی کہتا سگنل نہیں آ رہے تو کبھی کہتا فون ٹوٹ گیا ہے۔۔ جب کہ ان دس دنوں میں وہ کم ذات اور غلیظ

عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔''[۲۱]

یہ ہمارے سماج کی ایک تلخ حقیقت ہے جس سے منہ نہیں پھیرا جا سکتا۔ آج بھی بہت سی ایسی خواتین ہیں جو اکیلی زندگی گزار رہی ہیں، ان کو اُن کے شوہر چھوڑ کر رنگ رلیاں کسی اور کے ساتھ منا رہے ہیں۔ لیکن وہ بیچاری آج بھی معاشرے میں طرح طرح کے لوگوں کی باتیں سنتی ہیں کبھی یہ کہ اس عورت سے بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ لڑکا پیدا نہیں کر سکتی۔ تو کبھی اس کے کردار پر لوگ رائے دہی کر رہے ہوتے ہیں اس عورت کی معاشرے میں کوئی عزت و تکریم نہیں رہتی جس کو اس کا خاوند طلاق دے دے یہ چھوڑ کر چلا جائے اس کا معاشرے میں رہنا اس قدر مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ جی نہیں سکتی۔ اگر یہ کہا جائے تو درست ہوگا یہ معاشرہ اس کا جینا محال کر دیتا ہے وہ بیچاری پل پل مرتی ہے یہ عورتیں اس دن سے تھوڑا تھوڑا مرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب اُن کو تین بار ایک ہی لفظ سننا پڑتا ہے طلاق! طلاق! طلاق! عورت اگر نیک پاک باز، اعلیٰ اخلاقی قدروں کی مالک ہو تو وہ یہ سفاک الفاظ سنتے ہی مر جاتی ہے لیکن جو عورتیں مضبوط اعصاب کی مالک ہوتی ہیں وہ زندگی کے تلخ فیصلوں کو قبول کر لیتی ہیں وہ معاشرے کو فیس کرتی ہیں وہ یقین رکھتی ہیں زندگی کے نشیب و فراز میں ایسا ہوتا ہے ان فیصلوں کے ساتھ جینا ہے ان کو زندگی میں کوئی اور مل جاتا ہے یا وہ زندگی کو گزارنے کے لیے چیلنج لیتی ہیں یہ مسائل ان کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ ان کو کوئی اہمیت دیتی ہیں۔

میں اس طرح کے جبر اور استحصال کے خلاف ہوں جو انسانی زندگی کو توڑ کر رکھ دے یا اس کو کمزور کرنے کی کوشش کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے مکروفریب چہروں کو پہچاننے کی ضرورت ہے جو اس طرح کے مسائل کی راہ ہموار کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں ان لوگوں کا احتساب کرنے کی اشد ضرورت ہے اس طرح کے کرداروں کی وجہ سے کتنی عورتوں کے جذبات و احساسات مجروح ہوئے بلکہ خون ہوئے ان کا حساب ہونا چاہیے جنہوں نے کسی بھی عورت و مرد کے جذبات کا قتل کیا یہ وہ قتل ہوتا ہے۔

جس میں تلوار نہیں چلتی لیکن سانس رک جاتا ہے خون منجمد ہو جاتا ہے اور انسانیت کی توہین ہوتی ہے روبینہ فیصل نے اس طرح کے مکروہ دغا باز چہروں کو عیاں کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے اس کی داد بنتی ہے

انہوں نے جس طرح کے مسائل کو بیان کیا ہے وہ مسائل بہت پرانے ہیں لیکن کردار ضرور نئے ہیں روبینہ نے سماج میں مسائل کی بکھری ہوئی کرچیاں چنی اور پھر ان کو بڑی خوش اسلوبی اور حقائق کو سامنے رکھ کر لفظوں کی مالا میں پرو دیا۔

پروفیسر قیصر رضا رقم طراز ہیں:

> ''ان کے موضوعات ان کے لیے دل کی آوازیں ہیں، وہ ایک مشن سمجھ کر ان آوازوں کو لفظوں کا پیراہن پہنا کر پیش کرتی ہیں تاکہ ہمارے معاشرے کے یہ گمشدہ سائے، سائے نہ رہیں بلکہ یہ جیتے جاگتے کردار بن کر اس طرح ہمارے سامنے آ جائیں کہ ان کو سنے بغیر ہمارے پاس کوئی چارہ نہ رہے وہ ان سایوں کو مکمل انسان ثابت کر دینا کافی نہیں سمجھتیں بلکہ وہ ان کو ان کی جبری گمشدگی سے باہر لا کر معاشرے کے رو برو کرنا چاہتی ہیں تاکہ معاشرہ اپنے آپ کو پہچان سکے''[۲۲]

روبینہ کے افسانے ایسے لگتا ہے جیسے سماج میں پنپتے ہوئے مسائل کی کہانیاں ہیں انہوں نے بیشتر افسانے عورت کے مسائل کو اُجاگر کرتے ہیں جو وہ مختلف شکل میں دیکھتی ہیں۔ انہوں نے ان سب کو قریب سے دیکھا ہے روبینہ کے ہر افسانے میں عورت کے دکھ، غم، سسکیاں طرح طرح کے مصائب موجود ہیں اگر یہ کہہ دیا جائے کہ انہوں نے عورتوں کے مسئلوں کو بیان کیا ہے تو یہ بے جا نہیں ہوگا۔ لیکن کچھ افسانے ایسے ہیں جن میں مصنفہ نے عورت کو آئینہ بھی دکھایا ہے اس کی بے وفائی کا، دوہرے پن کا، مثال کے طور پر ''پاک سرزمین'' حلال عورت، باقی افسانوں میں انہوں نے عورت کے دکھ وغم سنے ہیں بیشتر افسانے مرد اور عورت کے درمیان گفتگو بحث ومباحثہ پر مشتمل ہیں روبینہ نے بتایا کہ ایک عورت کو کس طرح کے مسائل کا سامنا ہے اگر یہ بات کر دوں تو زیادہ مناسب اور بہتر ہوگی کہ روبینہ نے عورتوں سے ان کے مسائل دکھ رنج سن کر تحریر کر دیے ہیں اس کی داد بنتی ہے انہوں نے کہانیوں کو حقیقی بنانے کی کوشش کی ورنہ کافی ایسے لکھاری ہیں جو کرداروں سے تو ملتے ہیں لیکن ان کرداروں کے مسائل کو اس قدر خلط ملط کر دیتے ہیں کہ تمیز کرنا پیچیدہ ہو جاتا ہے اس لیے قاری اس سے منہ موڑ

لیتا ہے اور اس طرح کی تمام تحریریں بے معنی ہو جاتی ہیں چاہے وہ ناول ہو، افسانہ ہو، مضمون ہو اس سے فرق نہیں پڑتا قاری ان چیزوں کو زیادہ سنجیدہ لیتا ہے جو اس کی دلچسپی کو برقرار رکھے۔ روبینہ کے افسانوں میں یہ جادوئی کشش ہے کیوں کہ یہ حقیقی دنیا سے لی ہوئی کہانیاں ہے یہ کردار ہمارے گلی چوراہے کے کردار ہیں ان سے ہم کو اجنبیت بالکل نہیں ہوتی۔ لکھاری کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ حقیقی کرداروں کو ضبط تحریر کرے ایسے کردار پیش کرنے سے گریز کرے۔ جو حقیقی نہ ہو۔

روبینہ نے عورتوں کی بات زیادہ کی لیکن داد کی حق دار ہیں یہ باتیں درست اور گہرے مشاہدے کا منہ بولتی ثبوت ہیں۔ ان کے ہاں کوئی بات ایسی نہیں جو قاری کو کسی امتحان میں ڈالے جو اس کے لیے مشکل کا سبب بنے۔ ان کے سارے کردار سماج کے آئینہ دار اور عکاسی ہی۔ روبینہ نے اپنے کرداروں کے مسائل کو پورے انصاف دیانتداری کے ساتھ لفظوں کا سہارا لے کر قارئین کو بتانے کی کوشش کی ہے۔

احمد رضوان رقم طراز ہیں:

> ”روبینہ فیصل اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ وہ ایک ایسے مختلف الخیال اور تہذیب و تمدن پر مشتمل معاشرے میں سکونت پذیر ہیں جہان ان کا مکالمہ ہمہ صفت طبقہ زندگی، مختلف ثقافت کے لوگوں سے ہوتا ہے اور وہ ان کی بیان کی گئی کہانیوں میں عطر یاست کشید کر کے اپنے قلم، مشاہدے اور مطالعے کے ذریعے قاری تک پہنچانے کا سبیل کرتی ہیں افسانے کے بنیادی اجزا میں کہانی، کردار نفسیاتی لوازمات و عوامل میں توازن ہی کسی لکھنے والے کو کامیاب افسانہ نگار بناتا ہے روبینہ کا ہر افسانہ اپنی قیمتی ساخت اور تکنیک میں ایک سادہ و سلیس بیانیہ کی پرکاری نظر آتا ہے۔ ------۔ ادبی و فنی محاسن سے مالا مال ان کے افسانے زندگی کی بھر پور عمومیت کیساتھ کسی نہ کسی پہلو کی سفاکیت اجاگر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔“ ۲۳

روبینہ کے کردار ہم کو اصلاح کا دامن تھامنے کی تلقین کرتے ہیں ہم کو سماجی شعوری کی تدریس کرتے ہیں

تا کہ معاشرہ اعلیٰ اقدار اور کامیابیوں اور کامرانیوں کو چھو سکے انہوں نے جذبات کو قریب اور گہرائیوں سے محسوس کیا ہے۔

فیصل فارانی اپنے مضمون ''روبینہ فیصل اور افسانہ نگاری'' میں لکھتے ہیں:

> ''روبینہ فیصل اپنے افسانوں میں زیادہ جذبات کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گی۔''[۲۴]

مذکورہ افسانوں کی طرح روبینہ کا ایک افسانہ ''وارث'' جس میں عورت پر ستم کے ساتھ ساتھ بیٹا پیدا کرنے کی دھمکیاں اور پھر طلاق دے دی جاتی ہے جب وہ دو بیٹیوں کی ماں بن جاتی ہے اب اس افسانے کو لے کر بہت سے سوالات جنم لے اٹھتے ہیں پہلا سوال کیا بیٹا پیدا کرنا عورت کے اختیار میں ہے؟ کیا وہ نہیں چاہتی بیٹا پیدا کرنا؟ بہت سے سوالات پیدا ہو سکتے ہیں اب ہم اس افسانے کو حقیقی دنیا میں دیکھتے ہیں کیا ہمارے معاشرے میں اس طرح کے مرد پائے جاتے ہیں جو عورت کو طلاق اس لیے دیتے ہیں کہ وہ بیٹا پیدا نہیں کر سکتی؟ تو اس سوال کا جواب ہاں میں ہوگا۔ ہم سب جانتے ہیں اس طرح کے بہت سے کیس ہمارے معاشرے میں ہیں۔

مذکورہ افسانوں کی طرح اس افسانے میں بھی عورت پر جبر اور ظلم کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ مذکورہ افسانے میں بھی مرد کی بے وفائی، دوغلے پن، بے وفائی، دھوکے فریب، اخلاقی پستی، صنفی امتیاز کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مذکورہ افسانے میں جو بات بتانے کی کوشش کی گئی ہے وہ ہے صنفی امتیاز۔ اس افسانے کا نام ''وارث'' سے نام سے ہی ظاہر ہے کہ کوئی اپنے وارث کا تعاقب کر رہا ہے۔

اب سوال مرد کی طرف جاتا ہے کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ بیٹا پیدا کرنا یا بیٹی پیدا کرنا عورت کا اختیار نہیں۔ یہ بات سارے مرد جانتے ہیں لیکن پھر بھی عورت کو اس بات کا موردِ الزام ٹھہرا کر طلاق دے دیتے ہیں یہ گھٹیا عمل انسانی رشتوں اور بنیادوں کے لیے ایک زہر ہے جو آہستہ دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے ایسے مردوں کی ذہنی صلاحیت پر ہزاروں سوال اُٹھ جاتے ہیں میں ایک مرد ہونے کے ناطے اس عمل کو اس طرح کی گھٹیا سوچ

کی مذمت کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ایسے کام کے لیے انسانی زندگی نہیں بنی۔

ویسے ایک سوال ہے ایسے مردوں سے جو بیٹا دو عورت کو کہتے ہیں اگر یہ سوال عورت نے کر دیا مجھے بیٹی چاہیے ورنہ میں طلاق لیتی ہوں تو اندازہ کرو معاشرے میں کتنا بڑا مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ اس طرح تو انسانی زندگی کو ختم ہونے کا خطرہ لاحق ہوجائے گا اس وجہ سے ارتقائی عمل رک سکتا ہے۔

مجھے مردوں پر افسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ تسلیم کرتے ہیں بیٹا بیٹی دینا خدا کا صوابدیدی اختیار ہے تو دوسری طرف اپنی بیویوں کو کوستے ہیں کہ آپ میں کمی ہے آپ بیٹا پیدا نہیں کر سکتی۔ اس طرح کے مرد معاشرے کا گھٹیا ترین چہرہ ہوتے ہیں جو معاشرہ میں صنفی امتیاز کو جنم دیتے ہیں اولاد تو اولاد ہوتی ہے چاہے بیٹی ہو یا بیٹا لیکن ہمارے معاشرے کے کچھ مرد ایسے خیالات کے مالک ہیں زیادہ تعداد نہیں لیکن کم بھی نہیں مردوں کی نفسیات دیکھیے شادی ایک عورت سے کرنا چاہتے ہیں ناجائز تعلقات بھی ایک عورت سے رکھنے کے خواہاں ہیں لیکن گھر کی چار دیواری میں جنم لیتی عورت کو قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں منہ پھیر لیتے ہیں ایسے مردوں کو مرد کہتے ہوئے مجھے شرمندگی ہوتی ہے جو صنفی امتیاز کے قائل اور طرفدار ہوتے ہیں ہمارے معاشرے میں آج بھی بہت سی عورتیں موجود ہیں جو دن رات ظلم سہتی ہیں تشدد کا سامنا کرتی ہیں۔ طرح طرح کے جملوں کو برداشت کرتی صرف اس لیے کہ وہ بیٹا نہیں پیدا کر سکیں۔

روبینہ فیصل کے افسانے ''موٹی کی کہانی'' سے اقتباس دیکھیے:

> ''قسم سے میں بھی دلی شہر میں بہت معصوم ہوا کرتی تھی جب بیاہ کر کنیڈا آئی۔ تو میں تب بھی ہنستی تھی، جب لوگ کہتے واہ جی اس کا شوہر ڈاکٹر ہے تو میں بہت فخر سے تن جاتی تھی، اور خوب ہنستی تھی ہنسنے کے علاوہ مجھے آتا ہی کیا تھا۔ لیکن جب اس ڈاکٹر نے بچی کی پیدائش کے بعد روپ بدلا تو میں بکھرنے لگی میں ہنستی تو وہ کہتا پاگل لگتی ہو۔ میں بولتی تو کہتا فضول بولتی ہو، میں رونے لگتی تو کہتا تم کس قدر جذباتی اور بے وقوف عورت ہو، میں لڑتی تو کہتا تم ایک ٹیپکو عورت ہو، تم مجھے خوش نہیں رکھ سکتی، جب اس کے بے وفائیاں اور دھوکے پکڑنے لگی

> اور چیخنے چلانے لگی، تو کہنے لگا تم ایک نفسیاتی مریض ہو، میری خوشیوں کو
> برداشت نہیں کرسکتی۔'' [۲۵]

مذکورہ اقتباس میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مردوں کی ذہنیت کس قدر پستی کا شکار ہے ایک بیٹی کے پیدا ہوتے ہی ان کا پیار محبت میں اچانک تبدیلی آ جاتی ہے اس ذہنیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رفع کرنے کی ضرورت ہے اس سے سماج میں بہت بڑا بگاڑ جنم لے سکتا ہے اس طرح تو معاملات، زندگی بے ترتیب اور تنزلی کا شکار ہوجائیں گے میں اس سے حیران ہوتا ہوں کہ مرد کس طرح بدل جاتے ہیں ایک بیٹی کے پیدا ہوتے۔ حالانکہ یہ ان کی پیدا کردا ہے اس جان کو دنیا میں لانے والے وہ خود بھی ہیں لیکن بیٹی کا نام سنتے ہی ان کے دل میں جانے کیا چیز تنگ کرنے لگتی ہے اس کے بعد پھر عورت کی زندگی میں دکھوں کا اک نیا باب کھل جاتا ہے میاں توہین آمیز لہجے میں گفتگو کرنے لگ جاتا ہے روبینہ نے سماج کے بہت بڑے مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں کوئی دورائے نہیں یہ ایک سنجیدہ مسئلہ اس کو سلجھانے کی ضرورت ہے اگر ایسا نہ کیا گیا تو انسانی زندگی کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے کیونکہ یہ سوال انسانی بنیاد کا ہے بنیادیں اگر ہلنا شروع ہوجائیں تو عمارت کے گرنے کا خطرہ ہوتا ہے اس لیے اس گھٹیا تصور کو معاشرے سے نکال پھینکنا ہوگا تا کہ انسانی زندگی ایک بہت بڑے خطرے سے دو چار نہ ہوسکے سماج میں اس چیز یعنی مختصر ذہنیت کو دفن کرنے کی ضرورت ہے اولاد کو کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہیے خواہ وہ بیٹا ہو یا بیٹی وہ دونوں اپنے نصیب لے کر اس جہاں میں آتے ہیں۔

روبینہ فیصل نے اس افسانے کے ذریعے اہم اور بنیادی سبق دینے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ صنفی امتیاز انسانی حیات کے لیے موضوع نہیں اس کو ختم کرنے کی ضرورت ہے اور معاشرہ اس حرکت کا متحمل نہیں کہ اس میں بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دی جائے یا بیٹی کو بیٹے پر ترجیح دی جائے۔ روبینہ برابری کا درس دیتی ہیں انہوں نے اس ذہنیت کو ختم کرنے کی کوشس کی ہے اب یہ قارئین پر ہے وہ کتنا استفادہ کرتے ہیں۔

مردوں کو اس طرح کی مخصوص، گھٹیا ذہنیت، صنفی امتیاز جیسے خیالات کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا ہوگا اور یہ انسانی زندگی کا تقاضا ہے کیونکہ یہ چیزیں معاشرے میں بگاڑ کا سبب بن سکتی ہیں۔ اس سے سماجی زندگی متاثر

ہوسکتی ہے اور معاشرے کی جڑیں کمزور ہونے کا خطرہ ہے اگر اس کو ختم نہ کیا گیا تو وہ وقت دور نہیں یہ درخت پورے کا پورا دیمک کی زد میں آ کر مٹی میں جا ملے گا لہذا اس طرح کے صنفی امتیاز کو جڑیں اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے تا کہ سماجی زندگی کا بچاؤ کیا جا سکے۔

روبینہ کا ایک اور افسانہ بھی صنفی امتیاز کو بیان کرتا ہے پتہ نہیں ہم کو اپنے لیے بیٹے کی کیوں ضرورت ہے ہم اس کو ہی اپنا وارث مانتے ہیں۔ سوچنے کی ضرورت ہے وارث بیٹی کیوں نہیں ہوسکتی۔ یہ سماج ایسے کرداروں سے بھرا پڑا ہے جو خود تو ایک عورت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں لیکن اس سے توقع اور امید صرف لڑکے کی رکھتے ہیں جو عورتیں سسرال آ کر بیٹیاں پیدا کریں وہ خاوند اور اس کی تمام فیملی کو چبتی رہتی ہیں اس بیچاری کو ہر وقت کوستے رہتے ہیں اس بیچاری کو کئی عذاب اور دکھ سہنے پڑتے ہیں ''وارث'' افسانے کا ایک اقتباس دیکھیے۔

> ''ہاجرہ شادی کے پندرہ سالوں میں صرف دو بیٹیاں ہی پیدا کر سکی تھی جس کی وجہ سے اس کے میکے والے اُسے رحم بھری اور سسرال والے طنز بھری نظروں سے دیکھتے تھے وہ ان سب باتوں اور رویوں کی عادی ہو چکی تھی مگر پھر بھی شوہر ایسے الفاظ سن کر وہ ابھی بھی بے چین سی ہو جاتی تھی وہ اپنے شوہر سے محبت نہیں بلکہ اس کی پوجا کرتی تھی۔''[۲۵]

روبینہ نے ہاجرہ جیسی بہت سی عورتوں کی نمائندگی کی ہے جو آج بھی اسی طرح کے مسئلوں سے دو چار ہیں جو طرح طرح کے ظلم و جبر میں زندگی گزار رہی ہیں۔ ہاجرہ جیسی بہت سی عورتیں تشدد کے باوجود اپنے گھر کے ساتھ جڑی رہتی ہیں کہ کہیں بیٹیوں کی زندگی خراب نہ ہو جائے۔ وہ اخلاقی قدروں کو پامال ہونے سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں اور جبر میں زندگی کو گزارنے کو ترجیح دیتی ہیں میں ایسی عورتوں کو سلام کرتا ہوں لیکن میں ان عورتوں کو بغاوت کا مشورہ دوں گا ان کو خوشحال جینے کے لیے اگر کبھی بغاوت کرنا پڑے تو کر جائیں یہ زندگی دوبارہ نہیں ملنی کیوں کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شخص کو دوسرے کے احساسات کو مجروح کرنے کا حق حاصل نہیں ہے ہاجرہ بیچاری کا ہر روز قتل ہوتا ہے کیونکہ اس سے دو بیٹیاں پیدا کی ہیں اس کے جذبات و احساسات کے ساتھ اس طرح کا گھٹیا سلوک انسانی دائرہ کار میں نہیں آ تا۔

میں سوچتا ہوں کہ مرد حضرات عورت کو کیوں مورِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ اس نے بیٹا پیدا نہیں کیا اس کو چاہیے تھا کہ بیٹا ہی پیدا کرتی بیٹی کی کوئی ضرورت نہیں تھی اب اس طرح کا الزام عورت کو دینا گھٹیا سوچ تنگ نظری کم علمی کا عکاس ہے عورت بیچاری کے اختیار میں ایک چیز ہے ہی نہیں تو وہ کس طرح کر سکتی ہے۔ اب روبینہ کے کردار سجاد کو دیکھ لیں تو وہ ہر روز ہاجرہ کو کوستا ہے کہ تو میرا وارث پیدا نہیں کر رہی۔ یہ بات انسانی ذہن کی پیدا کردہ ہے کہ اگر بیٹا ہوگا تو میرا وارث ہوگا ایسا ہر گز نہیں بیٹیاں بھی وارث ہوتی ہیں لیکن ہمارے سماج کی بہت بڑی تعداد اس کو ماننے سے قاصر ہے سجاد نامی کردار دن رات اک ہی پریشانی کے عالم میں مبتلا تھا کہ بیٹا کیوں نہیں۔

اقتباس دیکھیں:

> ’’بیٹا نہ ہونے کی خلش اس کے دل میں پھانسی بن کر مسلسل چبھنے لگی تھی وہ خود سے اس قدر محبت کرتا تھا اور خود کو ایسا مکمل انسان سمجھتا تھا کہ یہ محرومی اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی وہ کیسے دنیا میں اپنا وارث، اپنا نام لیوا چھوڑے بغیر مر جائے گا۔ دن بدن اس کے اندر اپنی ذات کے نامکمل ہونے کا احساس شدت پکڑتا جا رہا تھا اس کی ماں بھی مرنے سے پہلے ہر وقت، اٹھتے بیٹھتے اسے ہی کہتی تھی کہ لگتا ہے بیٹا کہ تیرے باپ کا نام اور اس کی نسل تیرے چھوٹے بھائی سے ہی آگے بڑھے گی تو لگتا ہے تو بے نام اور نامراد ہی دنیا سے جائے گا تیرا نام نہیں رہے گا۔‘‘ [۲۷]

سجاد کی ماں کی بھی سمجھ نہیں آتی کہ ایک عورت ہونے کے باوجود وہ دوسری عورت کے وجود سے انکار کیسے کر سکتی ہے حالانکہ وہ یہ جانتی بھی ہے کہ عورت کے بس میں نہیں ہے بیٹا پیدا کرنا یہ تو خدا کی دین اور اسی کا فیصلہ ہے جو ہر چیز پر قادر ہے جس کے حکم کے سوا دنیا کی کوئی چیز حرکت بھی نہیں کر سکتی یہ تو اس کے فیصلے ہیں۔ ایسی عورتیں بھی اتنی ہی صنفی امتیاز پیدا کرنے والی ہیں جتنا کہ سجاد جیسے مرد۔۔۔

اگر ہم اس کہانی کو معاشرے میں دیکھیں تو یہ بات درست ہے معاشرے میں ایسے مرد موجود ہیں جو

عورت کو طلاق دے دیتے ہیں کہ اس نے بیٹا پیدا نہیں کیا یہ بیٹا پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ اگر یہ بات عورت کہے آپ میں بیٹا پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تو کیا ہوگا اس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوسکتا ہے گھریلو زندگی تباہ ہوسکتی ہے میں صنفی امتیاز کو معاشرے کے لیے ایک خطرہ مانتا ہوں اس سے انسانی معاشرے کی جڑیں ہل کر رہ جاتی ہیں ایسے نحیف خیالات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ انسانی ذہن کا پیدا کردہ اصول قانون ہے۔ جو نہ تو فطری طور پر درست ہے اور نہ ہی اخلاقی طور پر۔ یہ خیال انسانیت کو کمزور اور نقصان دینے والا تصور ہے۔ انسانیت اس سے ختم ہوسکتی ہے ارتقائی عمل میں ٹھہراؤ آ سکتا ہے انسانی معاشرہ تو اس کا متحمل ہی نہیں ہے۔

روبینہ نے اس افسانے کے ذریعے ایک بہت بڑے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی ہے افسانہ سبق آموز ہے اس افسانے کا موضوع اپنے اندر ایک پوری دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ انہوں نے معاشرے میں بڑھتے ہوئے صنفی امتیاز کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کو اُکھاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے یہ عمل معاشرے کے لیے نا موضوع ہے اس سے معاشرتی زندگی کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

اقتباس دیکھیے:

> ’’کاش بیٹی ہی ہوتی ابو۔۔۔ کاش!!! کچھ بھی نہ ہوتا ابو۔۔۔ وہ بیٹا بھی نہیں وہ بیٹی بھی نہیں ابو پتہ نہیں وہ کیا ہے۔۔۔ ابو میں برباد ہوگیا۔‘‘ [۲۸]

اب اسی بیچارے کے بیٹے کے ہاں تیسری جنس پیدا ہوجاتی ہے اس افسانے کا اختتام بہت سبق آموز ہے ان مردوں کے لیے عبرت ہے جو ڈیمانڈ کرتے ہیں بیٹا ہو بیٹی نہ ہو۔

کاش میں اس کردار کو ملتا تو پھر پوچھتا میاں اب بتا تیری نسل کہاں سے چلے گی؟ کون ہوگا تیرا وارث۔۔۔ کون اب تیرا نام لے گا؟ شکر ادا کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لینے والا ہے ایسا نہیں کہ آپ کا نام لینے والا کوئی نہیں سجاد کو شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ اس کے پاس بیٹیاں ہیں اب دیکھو اس کی انا کا کیا بنا۔۔۔

اس افسانے ’’وارث‘‘ سے بہت اچھا سبق ملتا ہے۔ کہ کبھی بھی باری تعالیٰ کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔ انائیں دفن ہوجاتی ہیں کبھی بھی انسانی رشتوں کو ٹھیس نہیں پہنچانی چاہیے کیونکہ یہ عمل فطرت کے اصولوں کو دوبارہ

لکھنے کے مترادف ہے۔ روبینہ نے قاری کو بتایا ہے کہ وقت بہت بے رحم ہوتا ہے اس کی پکڑ بہت سخت ہے۔

اگر روبینہ کے افسانوں کی بات کی جائے تو انہوں نے عورت کو زیادہ بیان کیا ہے انہوں نے سمندر پار اور پاکستان کی عورتوں کی نمائندگی بہت احسن طریقے سے نبھائی ہے روبینہ نے ان مردوں کو بھی بے نقاب کیا ہے جو عورتوں کو دیار غیر میں لے جا کر تنہا چھوڑ دیتے ہیں یہ سماجی مسئلہ ہے جس کو انہوں نے زیب قرطاس کیا ہے انہوں نے بتایا کہ مرد جھانسہ دے کر لے جاتے ہیں پھر ان پر وہ ظلم و ستم کرتے ہیں جو بیان کرنا مشکل ہے۔ دوسری طرف انہوں نے عورتوں کو آئینہ بھی دکھانے کی سعی کی ہے اس کی بہت بڑی مثال ''پاک سر زمین'' کا کردار یاسمین ہے۔ اسی طرح ''حلال بیوی'' میں عورت کا کردار عورت کو ہی اس کی اصلیت دیکھانے کی ایک کوشش کرتے ہیں یہ کردار جامد نہیں یہ کردار متحرک ہم کو معاشرے میں چلتے پھرے نظر آتے ہیں روبینہ نے ان کرداروں کا سہارا لے کر اصلاح کے فرائض سر انجام دیے ہیں۔

روبینہ کا ایک افسانہ ''شیری کا انتقام'' اس کہانی میں بھی انہوں نے عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کو بیان کیا اس کہانی میں موضوع بحث ہر وہ جبر ہے جو عورت پر کیا جاتا ہے ہر اس دکھ کو زیب قرطاس کیا ہے جو عورت زندگی کے مراحل میں دیکھتی ہے۔ مذکورہ افسانے کو تھوڑا سا بیان کرتے ہیں یہ شروع تو ایک مجبور عورت سے ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ عورت معاشرے میں بہت مقام تک پہنچ جاتی ہے یہ بڑی خوش آئین بات ہے کہ عورت نے اپنی ذات کے لیے جنگ لڑی اور وہ اس میں فتح یاب بھی ہوئی یقیناً شیری کی کہانی بڑی کہانی ہے یہ معاشرہ کی عورتوں کے لیے زندہ مثال ہے کہ مشکلات کے باوجود کبھی ہار نہیں ماننی چاہیے ایک دن منزل تک پہنچ جائیں گے۔

اس افسانے کی کردار شیری نے بہت مشکلات دیکھی بیچاری پر جنسی استحصال ہوا، خاوند نے طلاق دی طرح طرح کے مسائل نے اس کو گھیرا لیکن اس نے جدو جہد کا دامن نہیں چھوڑا۔

روبینہ کے تمام افسانوں کے کردار آپس میں مماثلت رکھتے ہیں۔ اس افسانے کے کردار میں ایک الگ طرح کا کچھاؤ ہے جو قاری کو اپنے حصار میں لے کر مسائل تک لے جاتا ہے۔ یہ کردار مضبوط اعصاب سے

معاشرے کا مظاہرہ کرتی ہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ اگر چاہے شیری کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے شیری کی ماں کے جسمانی تعلقات رام پرشاد نامی ایک شخص کے ساتھ ہوتے ہیں جو اونچی ذات کا ہندو ہوتا ہے یہ کہانی شیری سے شروع ہوتی ہے جس کی عمر گیارہ سال تھی اور رام پرشاد اس پر ظلم کے پہاڑ گرا دیتا ہے۔

اقتباس:

> ''جوانی تو خوب اُتری ہے ہیں؟ ہیں! یہ کہتے ہوئے رام پرشاد نے اس کے کچے سینے کو اپنے کالے بھرے ہاتھوں میں ملنا شروع کر دیا، ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ایک دم لال ہوئی ہوں گی اور ان سے ہوس بلا روک ٹوک ٹپکنے لگی تھی۔۔۔ کھڑے کھڑے اس کے سارے کپڑے اُتار کر وہیں زمین پر پھینک دیئے'' ۲۹

شیری کی ماں اسی رام پرشاد سے اس کی شادی کر دیتی ہے جس کی ہوس کا وہ شکار ہوتی ہے شیری کے اس میں سے دو بچے ہوتے ہیں۔ زندگی چلتی رہتی ہے بہتے ہوئے پانی کی طرح۔۔۔ پھر ایک وقت وہ آ جاتا ہے کہ شیری کو رام پرشاد گھر سے نکال دیتا ہے اس کو مار پیٹ رہا ہوتا ہے اچانک ایک وکیل کا کردار رونما ہوتا ہے جو شیری کو اپنی زندگی میں جگہ دے دیتا ہے یہ کردار بہت نیک دل ہے جو شیری کو زندگی کی ہر آسائش دینے کے لیے تیار ہوتا ہے لیکن شیری اس کی بیوی بن کر جی نہیں سکتی کچھ دن تو وہ اس کی پناہ میں رہتی ہے کیونکہ رام پرشاد دنیا کی اور رنگینیوں میں کھو جاتا ہے اور شیری کو وکیل کی بانہوں میں سونپ دیتا ہے۔

اقتباس دیکھیے:

> ''اتنا ہی ہمدرد ہے تو لے جا اس کتیا کو اور اس کے پلوں کو۔۔۔ جا کے پال۔۔۔ انسانیت انسانیت۔۔۔ لے جا اس انسانیت کو اپنے ساتھ۔۔۔ بن جا انسان۔۔۔ میں حیوان ہی بھلا۔۔۔ پھر شیری کی طرف دیکھتے ہوئے غراتا۔۔۔ گھس جا اس کے بازوؤں میں۔۔۔ اب اس کے ساتھ ہی

> مرنا۔۔۔۔میرے گھر گھسی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' [۳۰]

وکیل نے رام پرشاد کو جیل ڈلوا دیا اور شیری کو اس سے طلاق بھی دلوا دی وکیل ایک نیک اور عزت دار شخص تھا اس نے شیری کو بہت عزت دی شیری کا رام پرشاد سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی وکیل کے گھر شیری نے اپنے آپ کو بہت اپ گریڈ کیا تھا پھر ایک دن اتر پردیش میں بیٹھے ایک انیس سالہ غریب خاندان کی لڑکی شیری کے ساتھ پینتالیس سال کے ڈھلے شخص سے تعلقات قائم ہونا شروع ہوجاتے ہیں اس میں شیری کی بھی دل چسپی تھی۔ شیری ایک رکھیل کے لیبل سے چھٹکارا پانا چاہ رہی تھی حالانکہ وکیل نے اس کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا تھا۔لیکن اس مورتی نامی شخص نے اس قدر اپنے جال میں پھنسایا کہ شیری اس کے ساتھ کینیڈا کی سرزمین کے خواب دیکھنے لگی آخر وہ وقت آ گیا شیری کو مورتی کینڈا لے گیا جو اصل میں وہاں کسی گوری کا ملازم تھا۔

مورتی تو رام پرشاد سے بھی دوگنا ظالم انسان تھا بلکہ اس کو انسان کہنا بھی انسانیت سے نا انصافی ہوگی اس شخص نے شیری پر بہت ظلم وستم کیے۔ شیری نے ایک بہت بڑی غلطی کی وکیل کو چھوڑ کر۔

روبینہ نے اس کردار کے ذریعے بتایا ہے کہ زندگی کے فیصلے جذبات میں کرنے سے بہتر ہے کہ ان پر غوروفکر کرلو سرسبز باغ دیکھ کرمت فیصلے کرو ورنہ پوری عمر آپ کو اس ایک فیصلے کا ازالہ کرنا پڑے گا اب اگر یہ اس افسانوی کردار کو دیکھے تو یہ افسانوی نہیں لگتا ہے معاشرہ کا آئینہ دار ہے آج بھی ہمارے معاشرے میں بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو مورتی جیسے بندے کے خواب دیکھ کر زندگی کا فیصلہ کرتی ہیں زندگی کا فیصلہ سالوں میں کرنا چاہیے منٹوں میں ہرگز نہیں۔ جو فیصلے منٹوں میں ہوتے ہیں بعض اوقات ساری زندگی یا سالوں بھر ٹھیس پہنچاتے رہتے ہیں اس افسانے کے ذریعے روبینہ نے عورتوں کی جلد بازی کو بھی بتایا ہے جو تیزی کا مظاہرہ کرتی کرتی دلدل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پھنس جاتی ہیں۔ جس طرح افسانے میں شیری کا کردار ہے۔

اقتباس دیکھیے:

> ''مورتی نے جو بڑے بڑے خواب شیری کی آنکھوں میں جگائے تھے ان کی تعبیر یہ بند بیسمنٹ، مارکٹائی جھوٹوں کے لاتعداد پلندے اور یورنہری انفیکشن کے تحفہ کی صورت، اس کی آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے۔ شیری، انفیکشن

> کے درد سے بے حال ہو کر تڑپنے لگتی اور ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہتی تو اسے جواب ملتا کہ ''ہیلتھ کارڈ کا انتظار کرو، مرتو نہیں جاؤ گی، میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ تمہارے لیے فضول ڈاکٹرز کو دوں۔''۳۱

روبینہ نے ایک افسانوی کردار کے ذریعے ان عورتوں کو بتایا ہے جو جلد بازی میں وہ فیصلے کر لیتی ہیں جو ان کی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔

اس افسانے سے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ ہے عورت پر ظلم وستم ہو رہے ہوں تو اس کو بغاوت کر دینی چاہیے جس طرح شیری کا کردار کرتا ہے جس طرح سے شیری نے مورتی کو چھوڑ دیا اور فٹ پاتھ کی زندگی کو درست جانا۔ بغاوت کے وقت اس نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ دیار غیر میں میرا کوئی نہیں لیکن اس نے بڑی ہمت بہادری کے ساتھ زندگی سے لڑنے کو ترجیح دی۔ اگر اس کی حالت کی بات کریں تو اس کی حالت بہت غیر تھی کچھ رام پرشاد کے ستم اور کچھ مورتی کے ظلم نے اس کو ختم ہی کر کے رکھ دیا تھا اس نے اپنے بچاؤ کے لیے مورتی جیسے گھٹیا کردار کو چھوڑنا ہی مناسب جانا۔ شیری کی زندگی وہاں سے بدل جاتی ہے جب وہ بغاوت کو ترجیح دے دیتی ہے اور اپنے حقوق کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے یہ بیچاری بیماری کی وجہ سے فٹ پاتھ پر ہی بے ہوش ہو جاتی ہے لوگ اس کو شیلٹر ہوم میں لے جاتے ہیں وہاں تو شیری کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوشیوں کے خیابان میں پناہ گزین ہو جاتی ہیں۔

اقتباس دیکھیے:

> ''اس شیلٹر ہوم میں وہ دنیا تھی جو شیری کے خوابوں کی دنیا تھی ''برابر کی دنیا''۔۔۔ وہاں زندگی میں پہلی دفعہ اسے لگا کہ کہ وہ باقی انسانوں کی طرح ایک انسان ہے۔۔۔ نہ رنگ، نہ مذہب، نہ جنس اور نہ ذات وہ یہاں کسی بنیاد پر تحقیر کا نشانہ نہیں بن رہی۔۔۔ وہ کم شکل تھی، مگر جب سے وہ اس چار دیواری میں آئی تھی، اسے ہر دوسرے منٹ میں یہ سننے کو ملتا اوہ یو آر لکنگ سو پریٹی۔۔۔ یو آر سونائس۔۔۔ یو آر لکنگ گا جیس۔ یہ سب سن کر وہ خوشی سے

> پھولی نہ سماتی اور اس کی شخصیت میں اعتماد آنے لگا'' ۳۳؎

اس شیلٹر ہوم میں نہ صرف علاج ہوا بلکہ شیری نے وہاں سے انگلش لینگویج کی کلاسوں کے ساتھ ساتھ وہاں پر کمپیوٹر کے کورسز بھی مکمل کیے ایک دور وہ آ گیا جب اس کو عورتوں کی ایک این جی او میں نوکری مل گئی اس دن سے وہ کامیابی کے دائرے میں آ گئی کیونکہ اب وہ بااعتماد، خودمختار عورت بن گئی تھی اس سے پہلے وہ اس سے محروم تھی۔ میں کہتا ہوں عورت کو زندگی کے تمام فیصلوں کو کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہیے اور اپنی ذات کو منوانے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو ضرور بروئے کار لانا چاہیے جس طرح سے شیری نے اپنی عزت و ناموس کو پامال ہوتے، دن رات کے جبر استحصال کو برداشت کیا، لیکن اس میں زندگی کو جینے کا ڈھب آ جاتا ہے عورت میں بھی بہت بڑی صلاحیت ہے روبینہ شیری کے ذریعے معاشرے کی ان عورتوں کو مسائل سے لڑنے کو ترجیح دیتی ہیں جو زندگی کے ایک غلط فیصلے کو لے کر ہی زندگی گزار دیتی ہیں روبینہ ان کو بتاتی ہیں زندگی میں آگے بڑھ جاؤ آپ میں بہت سی صلاحیتیں دبی ہوئی ہیں ان کو بیدار کرو، بروئے کار لاؤ، نکھارو جس طرح شیری نے ثابت کیا پھر وہ وقت آیا جب شیری اس قدر مضبوط ہوگی وہ دنیا کی دوسری عورتوں کو سمجھاتی کہ ان مسائل سے لڑو تم ایک دن جیت جاؤ گی دل لگا کر اپنا کام کرو اس دنیا کی نہ سنو۔

اقتباس دیکھیے:

> ''اپنے لیے جیو۔۔۔ پہلے اپنا آپ پھر کچھ اور یا کوئی اور۔۔۔ خود خوش اور مضبوط ہوگی، تو باقی کی دنیا بھی عزت کرے گی، ورنہ سب پیروں تلے روند دیں گے۔۔۔'' ۳۳؎

روبینہ کا یہ افسانوی کردار جاندار اور سبق آموز کردار ہے جو مسائل کی بے رخی سے گزر کر اب بہت مضبوط ہوگیا ہے اب وہ دوسروں کو ان مسائل سے لڑنے اور مضبوط اعصاب کے ساتھ مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

مذکورہ اقتباس میں شیری کی بات درست ہے کہ اگر انسان خود ہی نہیں جی رہا تو وہ کسی دوسرے کے لیے نہیں جی سکتا ہے خود کو معاشرے میں رہنے کے قابل بنانے کی ضرورت ہے، پھر معاشرے میں حیات، لمحات

خوشگوار گزر سکتے ہیں ورنہ زندگی تھم جائے گی منجمد ہو جائے گی اگر آپ اپنی حیات خود نہیں جی تو سمجھ جی ہی نہیں رہے۔ شیری جیسے کردار سے روبینہ نے ایک بات واضح کی ہے کہ زندگی جس قدر بھی مشکل ہو اس کو کامیابی کی راہ پر لایا جا سکتا ہے۔ شیری ایک ایسا مضبوط اور ثابت قدم کردار ہے جو ایک مثال بن کر رہ گیا کہ جس نے معاشرے سے دکھ درد ہی پائے وہ آج اس قدر مضبوط اور کامیاب بن گئی کہ ایک عورت کو شیری سے سبق سیکھنا چاہیے اور اپنی اندرونی بیرونی طاقتوں کو بروئے کار لا کر زندگی کو کامیابیوں سے ہم کنار کرنا چاہیے کبھی دیر نہیں ہوتی آپ جس وقت چاہیں اپنے آپ کو بدل سکتے ہیں لیکن شرط ہے کہ آپ کو پوری ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ محنت جدو جہد کرنی ہوگی اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ معاشرہ کبھی بھی آپ کی نہیں سنے گا آپ کو محنت کرنی پڑے گی کہ وہ آپ کی بات سنے کہ آپ کیا کہنے کی صلاحیت واہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے لیے شیری کا کردار ایک مثالی کردار ہے جس نے بہت سے دکھوں کے بعد اپنی زندگی کو درست راہ پر پایا جس نے زندگی میں کبھی خوشیاں نہیں دیکھی تھی اب اس کے لیے خوشیاں ہی خوشیاں ہیں یہ سب اس کی محنت جہد مسلسل کا ثمر ہے۔

روبینہ نے معاشرتی زندگی کو اس طرح سے افسانوی صورت میں پیش کیا ہے کہ وہ افسانے حقیقی لگتے ہیں ان کے کردار متحرک محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے معاشرتی زندگی کو افسانوں میں بیان کیا انہوں نے تہذیبی، معاشی زندگی کو افسانوں میں بیان کرنے کی جو سعی کی ہے وہ ایک زندہ مثال ہے انہوں نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فکشن میں انسانی زندگی کو کھل کر بیان کیا جا سکتا ہے۔

اس میں دو رائے نہیں ہے کہ افسانہ ایک طرح سے معاشرتی تہذیبی مسائل کا آئینہ دار ہوتا ہے اس میں انسانوں کے مسائل احوال معاملات واقعات قلم بند کیے ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات کی جائے کہ افسانہ نگار معاشرے کی سسکیاں دکھوں، غموں کی دوا دینے کا کام کرتے ہیں۔ جہاں تک روبینہ کے افسانوں کی بات کریں تو ان کے افسانوں میں معاشرے کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ انسانی زندگی کو بیان کرتے ہیں انہوں نے پوری لگن اور محنت سے معاشرے میں بکھرے مسائل کو محسوس کیا۔ میں ایک بات کرنا چاہوں گا اگر چہ انہوں نے اپنے روز و شب کنیڈا کی فضا میں گزار رہی ہیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ دکھ درد تو ایک طرح کے ہیں جو انہوں نے لکھے۔

دکھ، درد، مسائل، حالات رنگ ونسل کو دیکھ کر تھوڑے آتے ہیں وہ تو کسی کی بھی زندگی کو بے ترتیب کر سکتے ہیں۔

روبینہ نے بتایا ہے کہ مسائل تقریباً ایک طرح کے ہیں انہوں نے کنیڈا اور پاکستان میں انسانوں کو درپیش مختلف مسائل کو قلم بند کیا ہے اُن کا موضوع انسانی زندگی ہے۔

انہوں نے اپنی کتاب ''خواب سے لپٹی کہانیاں'' کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

> ''میں نے پاکستان اور کینیڈا میں بکھری اپنے ہی لوگوں کی کہانیاں اکھٹی کیں جو کسی نہ کسی طرح میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں اور مجھے اتنا تنگ کرتیں کہ میں راتوں کو سو نہیں پاتی تھی۔'' ۳۴

یہ بات روبینہ کے افسانوں میں واضح ہے کہ انہوں نے پاکستان کے مجبور استحصال زدہ عورت کی کہانی، عورت پر جنسی تشدد نا انصافی، انسانی بے رحمی، صنفی امتیاز کو بہت باریکی سے دیکھا۔

انہوں نے کہانیاں ہمارے معاشرے کی کہانیاں سنائی ہیں یہ واقعات سماج کے عکاس ہیں ان کی کہانیاں تاثر سے بھر پور ہیں وہ قاری کو خود مجبور کرتی ہیں کہ وہ اُن کو پڑھے اگر کوئی قاری اُن کے کسی افسانے کو شروع کرے تو وہ اس افسانے کو مکمل کر کے ہی دم لے گا قاری کی کسی بھی کہانی میں اس وقت زیادہ دل چسپی ہوتی ہے جب وہ اس کو حقیقی اور سماج کی آئینہ دار نظر آئے اُن کی تمام کہانیوں میں یہ تاثر اور اہلیت ہے کہ وہ قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں روبینہ کی کہانیوں میں دلچسپی اور تاثر کا عنصر پنہاں ہے۔

روبینہ فیصل کے بارے میں امجد اسلام امجد رقم طراز ہیں:

> ''روبینہ نے جس طرح سے اپنی مہکی ہوئی دنیا کے مانوس اور کچھ کنیڈا کے شب و روز سے مخصوص گوشوں کو دیکھا اور دکھایا ہے۔ وہ بلاشبہ داد تحسین اور گہرے مطالعے کے لائق اور حق دار ہیں کہ ان میں دو مختلف دنیائیں ایک ہی ناظر کے مشاہدے اور تجربے سے اس طرح سے گزار رہی ہیں کہ قاری اپنے آپ کو منظروں میں شامل پاتا ہے'' ۳۵

کسی بھی کہانی کے لیے بڑا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ قاری اس کو پڑھے اور اس سے کچھ اصلاح کا

دامن پکڑ لے کسی بھی لکھاری کے لیے یہ بڑا نہیں کہ اس کی کہانی میں بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال ہے اس میں بڑی بڑی تراکیب میں کوئی بھی کہانی زندہ اس لیے رہ جاتی ہے کیوں کہ وہ معاشرے کی حقیقی کہانی ہے یا پھر اس میں اصلاح کا پہلو موجود ہے۔ میرے خیال میں کسی بھی لکھاری کا مقصد تفریح نہیں ہونا چاہیے بلکہ معلومات فراہم کرنا، سماجی برائیوں کی اصلاح کرنا ہونا چاہیے جب بھی کوئی لکھاری اپنی کوئی تحریر لکھ رہا ہوتا ہے تو وہ معاشرتی خامیوں، خوبیوں کو اجاگر کرے اس کا اصل مقصد اصلاح سماجی فلاح ہونا چاہیے میں اس ادب کے خلاف ہوں جو تفریح ادب بن کر رہ جاتا ہے میں یہ سمجھتا ہوں تفریحی ادب دیرپا نہیں رہ سکتا ہے وہ ایک طرح سے ناپائیدار ہوتا ہے۔

روبینہ فیصل کے سارے افسانے اصلاحی ہیں وہ خود بھی اپنی اصلاح کرتے ہوئے نظر آتی ہیں اور اصلاح کی ترغیب دیتی ہیں شیری کا کردار زندہ کردار ہے باقی بھی افسانوں میں انسانی مسائل کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح سے انسانی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں جس طرح سے ایک ''ڈائری میں گم گھر کا سارا سامان'' ماریہ کا کردار سماج کا زندہ کردار ہے یہ افسانوی کردار لگتا ہی نہیں یہ اصلی کردار ہے جس کو خاوند کے دیئے ہوئے دکھ قبر تک لے جاتے ہیں۔

یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو بظاہر خوش لیکن اندر سے دکھی ہے وہ ساری عمر اپنے دل کا راز چھپائے رکھتی ہے اور یہ دکھ اس کو اندر سے دیمک کی طرح کھاتا رہتا ہے اور اسے جذباتی طور پر کھوکھلا کر دیتا ہے وہ اپنے تمام رازوں کو ڈائری میں قلم بند کر دیتی ہے اور جب اس کے مرنے کے بعد اس کی ڈائری شمسہ نکالتی ہے تو وہ اس پر یہ راز افشاں ہوتا ہے کہ وہ کس قدر مشکل میں تھی کس طرح کی اس نے زندگی گزاری وہ محبت جو ایک سراب تھی اصل میں ایک عذاب تھی۔

ڈاکٹر خالد سہیل لکھتے ہیں:

> ''روبینہ کے افسانوں کے نسوانی کردار محبت کی تلاش میں رہتے ہیں ان کے لیے محبت ایک سراب کی طرح ہے وہ جتنا اس کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ سراب اتنا ہی دور ہوتا جاتا ہے محبت کو نہ پانا اور پا کر کھو دینا ان کی ذات اور زندگی کا المیہ بن جاتے ہیں۔''[۳۶]

حوالہ جات

۱- عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے، لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۵۱، ص: ۱۴۴

۲- ایمن انصاری، ڈاکٹر، اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، لکھنو، نصرت پبلشرز، ۱۹۸۸، ص: ۱۸

۳- رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶، ص: ۷

۴- احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں نسائیت، رابعہ الرباء، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۶، ص: ۱۹

۵- روبینہ فیصل، گمشدہ سائے، لاہور، قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ۲۰۱۹، ص: ۱۱

۶- ایضاً، ص: ۱۷

۷- ایضاً، ص: ۲۹

۸- ایضاً، ص: ۲۰

۹- ایضاً، ص: ۳۲

۱۰- ایضاً، ص: ۳۷-۳۶

۱۱- ایضاً، ص: ۱۷

۱۲- ایضاً، ص: ۶۵

۱۳- ایضاً، ص: ۱۲

۱۴- ایضاً، ص: ۶۶

۱۵- ایضاً، ص: ۱۶

۱۶- ایضاً، ص: ۹۰

۱۷- ایضاً، ص: ۹۰

۱۸- ایضاً، ص:۹۱

۱۹- روبینہ فیصل، خواب سے لپٹی کہانیاں، لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۱۶، ص:۹

۲۰- ایضاً، ص:۱۰

۲۱- روبینہ فیصل، گمشدہ سائے، لاہور: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ۲۰۱۹، ص:۱۱۸

۲۲- ایضاً، ص:۱۹۶

۲۳- ایضاً، ص:۱۹۳

۲۴- ایضاً، ص:۲۴

۲۵- ایضاً، ص:۱۳۷

۲۶- ایضاً، ص:۱۶۵

۲۷- ایضاً، ص:۱۶۶

۲۸- ایضاً، ص:۱۷۸

۲۹- ایضاً، ص:۱۴۸

۳۰- ایضاً، ص:۱۵۲

۳۱- ایضاً، ص:۱۵۹

۳۲- ایضاً، ص:۱۶۲

۳۳- ایضاً، ص:۱۶۲

۳۴- روبینہ فیصل، خواب سے لپٹی کہانیاں، لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۱۶، ص:۹

۳۵- روبینہ فیصل، گمشدہ سائے، لاہور: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ۲۰۱۹، ص:۱۳

۳۶- https://www.humsub.compk/295009/khalid/sohail.274

☆☆☆

محاکمہ

محاکمہ

اردو زبان کی گذشتہ دوسو سالہ تاریخ میں اردو افسانے کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے جس طرح مرد افسانہ نگاروں نے اس کو آگے بڑھانے میں کردار ادا کیا وہاں عورتوں نے بھی کوئی کم خدمت گزاری نہیں کی۔ خواتین افسانہ نگاروں میں بہت سے ایسے نام ہیں جنہوں نے شہرت اور قبولیت کے بام عروج کو جا چھوا ہے اس میں امرتا پریتم، عصمت چغتائی ، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، نیلم بشیر، کشور ناہید، خالدہ حسین، رضیہ بٹ، بانو قدسیہ، جیسی خواتین نے افسانہ نگاری میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

روبینہ فیصل نے ''گمشدہ سائے'' کی صورت میں اردو افسانے کی روایت میں ایک نئے شجر کا اضافہ کیا ہے جس کے سائے تلے بہت سے کرداروں نے پناہ لی ہے۔

''گمشدہ سائے'' کے افسانے ہمارے معاشرے کے حقیقی عکاس ہیں۔ روبینہ نے کردار ہمارے معاشرے کے زندہ اور جیتے کردار ہیں یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ افسانے اردو افسانے کا کوئی گمشدہ خزانہ تھا جس کو روبینہ نے دریافت کر کے اردو میں متعارف کروا دیا اُن کے افسانے قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں کیوں کہ یہ اصلی اور حقیقی کہانیاں ہیں۔ روبینہ کے اس مجموعہ میں انسانی زندگی کے مسائل کو بہت قریب سے دکھایا گیا ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ روبینہ نے ان کرداروں کے مسائل سنے اور ان کی دل جوئی کی۔ ان کو حوصلہ دیا روبینہ نے شاید قاری کے سامنے افسانوں کی صورت میں اس لیے رکھے کہ قاری ان مسئلوں کو حل کرے ایسا لگتا ہے جیسے روبینہ اپنے قاری سے مدد مانگ رہی ہیں کہ آؤ مل کر یہ سارے مسئلے حل کریں تا کہ معاشرے میں خوشحالی ہو سکے۔

ان کہانیوں میں سماج کی عکاسی بہت ہی انوکھے نرالے انداز میں کی گئی بعض اوقات لگتا ہے کہ روایتی موضوعات ہیں یہ بات درست ہے لیکن یہ مسائل روایتی ہو سکتے ہیں لیکن ان مسائل نے بھی سماج میں مختلف کرداروں کو اپنی جکڑ میں لیا ہے اور ان مسائل نے اپنے لیے ہر دفعہ نیا شخص چنا ہے جس کی وجہ سے یہ مسائل بھی

نئے محسوس ہوتے ہیں یہ مسائل ہر دفعہ نئے ہوجاتے ہیں جب نئے شخص سے ملتے ہیں اس میں کوئی دورائے نہیں کہ روبینہ نے سماجی دکھوں کی روداد سنی ہے سماجی مسائل سے ملی ہیں تب جا کر انہوں نے کہانی کی صورت میں اپنے مشاہات، تجربات کو قلم بند کیا ہے۔ اُن کے افسانے معنویت اور بہت سے اسباق سے بھرے ہوئے ہیں ان افسانوں میں واضح دیکھا جا سکتا ہے کہ روبینہ کا سماجی شعور کس قدر بلند و اعلیٰ تھا ان کی تمام کہانیاں سماج کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں اور روبینہ نے کرداروں کے دل کی باتیں سنیں ان کو حوصلہ دیا۔ ان کو بتایا کہ آپ دنیا میں کچھ کر سکتے ہوں۔ روبینہ نے اپنے افسانوی کرداروں کے جذبات و احساسات کو محسوس کیا ہے یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے لیکن روبینہ نے بڑی بہادری ہمت سے سرانجام دیا ہے۔ اس مشکل کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر روبینہ نے دم لیا۔

اردو افسانوی دنیا میں روبینہ کے اس افسانوی مجموعے گمشدہ سائے کو یاد رکھا جائے گا کیوں کہ یہ ایک مزید اضافے کا سبب بنا ہے انہوں نے معاشرے میں بکھرے ہوئے کرداروں کے طرح طرح کے مسائل کو سنا اور اُن کو اکٹھا کر کے ایک کتاب میں مرتب کر دیا ان کی اس خدمت کو یاد رکھا جائے گا۔

کتابیات

کتابیات

بنیادی ماخذ:

۱۔ روبینہ فیصل، گمشدہ سائے، لاہور، قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، ۲۰۱۹

ثانوی ماخذ:

۱۔ روبینہ فیصل، خواب سے لپٹی کہانیاں، لاہور، ماورا پبلیشرز، ۲۰۱۶

۲۔ روبینہ فیصل، روٹی کھاتی مورتیاں، لاہور، ماورا پبلیشرز، ۲۰۱۰

۳۔ وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۷

۴۔ مجنوں گورکھپوری، افسانہ اور اس کی غایت، گورکھپور، ایوان اشاعت، ۱۹۳۵

۵۔ شکیل احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، گورکھپور، آفسٹ پریس، ۱۹۸۴

۶۔ گوپی چند نارنگ، پروفیسر، (مرتبہ) اُردو افسانہ روایت اور مسائل، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰

۷۔ زاہدہ بی، ڈاکٹر، راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ، علی گڑھ، وانگمیہ بکس، ۲۰۱۴

۸۔ نجم الہدی، ڈاکٹر، کردار اور کردار نگاری، پٹنہ، بہار اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۰

۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے، لاہور، مکتبہ اُردو ۱۹۵۱

۱۰۔ ایمن انصاری، ڈاکٹر، اُردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، لکھنؤ، نصرت پبلیشرز، ۱۹۸۸

۱۱۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اُردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۶

۱۲۔ رابعہ الربا، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں نسائیت، ، لاہور، شرکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۶

۱۳۔ انور سعید، ڈاکٹر، ایک صدی کے افسانے، لاہور، سرکلر روڈ چوک اُردو بازار، ۲۰۱۰

۱۴۔ پروین اظہر، ڈاکٹر، اُردو میں مختصر افسانے نگاری کی تنقید، لاہور، بک ٹاک، ۲۰۰۹

۱۵۔ عبدالقادر سروری، اصول افسانہ نگاری، لاہور، عکس پبلیشرز، ۲۰۱۹

۱۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو افسانہ نگاری، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰

۱۷۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ فن ہنر اور متنی تجربے، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲

۱۸۔ نورین رزاق، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین افسانہ نگار، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۲۰۱۶

۱۹۔ نزہت عباسی، ڈاکٹر، اُردو کے افسانوی ادب میں نسائی لب ولہجہ (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۳

☆☆☆